جولائی ۱۹۵۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ :

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مُختصر حواشی

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیمُ القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: -/۱۷۵ روپے

اِدارہ ترجمانُ القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۹ جولائی ۱۹۹۳ عدد ۷

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۵۳۲۰

ماہنامہ
ترجمان القرآن
لاہور

جلد ۱۱۹ عدد ۷

جولائی ۱۹۹۳ محرم الحرام ۱۴۱۴

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۴۲۱۲۰۷۴ فیکس: (۰۴۲) ۴۲۴۲۱۹

برائے انتظامی امور رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰ فون نمبر ۲۲۳۰۱۴ ۲۲۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر ۱۲۴۲

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ مینجر ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

نراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۶ روپے ○ زر سالانہ: ۶۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۱۸۰ روپے یورپ: ۲۵۰ روپے امریکہ و آسٹریلیا: ۳۲۵ روپے

پبلشر حسین فاروق مودودی نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' اپنے اجلاس منعقدہ ۲۲ - ۲۳ مئی ۱۹۹۳ میں متفقہ طور پر' آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ایک وسیع تر پلیٹ فارم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے مطابق ۲۴ مئی کو لاہور میں ایک ملک گیر کنونشن منعقد ہوا' اور پاکستان اسلامک فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

یہ فیصلہ ایک اہم فیصلہ ہے۔ مگر اپنی نوعیت کا کوئی نیا فیصلہ نہیں۔ جب سے جماعت نے انتخابات میں حصہ لینا شروع کیا ہے' بالعموم کوئی وسیع تر پلیٹ فارم ہی بنایا ہے۔ ۱۹۵۱ میں جب پہلی دفعہ پنجاب کے انتخابات میں حصہ لیا' تو ایک پنچایتی نظام تشکیل دیا۔ کوئی دو نظائر ہر پہلو سے یکساں نہیں ہوتے۔ مگر فرنٹ کی طرح' پنچایتوں میں بھی جماعت کے باہر سے جماعتیں نہیں بلکہ افراد شریک تھے۔ یہ بھی صرف پیشِ نظر انتخاب کے لیے بنی تھیں۔ (اگرچہ جماعت فرنٹ کو مستقل حیثیت بھی دے سکتی ہے)۔ یہ فرق بھی ضرور ہے کہ پنچایتوں کا نظام ملک گیر نہ تھا' اس کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی' اور اس میں جماعت بحیثیت جماعت نہیں' بلکہ جماعت کے افراد شریک تھے۔ ۱۹۷۰ میں جماعت نے براہِ راست تو حصہ لیا' مگر ایک وسیع تر مفاہمت کا راستہ بھی اختیار کیا۔ لیکن بس یہ آخری الیکشن تھا جو جماعت نے بلا واسطہ لڑا۔ ۱۹۷۷ میں اس نے پاکستان قومی اتحاد کے واسطہ سے حصہ لیا' اور ۱۹۸۸ و ۱۹۹۰ میں اسلامی جمہوری اتحاد کے واسطے سے۔ یہ دونوں اتحاد ایک لحاظ سے فرنٹ سے مختلف بھی تھے۔ وہ یہ کہ ان میں' جماعت کی دعوت پر شریک ہونے والے افراد کے بجائے' جماعتیں شریک تھیں' ہر قسم کی دینی و لادینی جماعتیں۔ لیکن فرنٹ کی طرح ان کی بھی باقاعدہ ملک گیر تنظیم تھی' عہدیدار تھے' دستور بھی تھا۔ بظاہر یہ

صرف انتخابات میں شرکت کے لیے بنے تھے، لیکن ۱۹۷۷ میں بھی جماعت نے یہ واضح کردیا تھا کہ قومی اتحاد کوئی بھان متی کا کنبہ نہیں کہ انتخابات کے بعد ٹوٹ جائے، بلکہ یہ قائم رہے گا، اور جیت گیا تو جماعت اتحاد کی حکومت بھی بنائے گی۔ اور، ۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد تو جماعت کی مجلسِ شوریٰ نے باقاعدہ فیصلہ کیا کہ "جس وقت بھی انتخابات ہوں ان میں حصہ لینے کے لیے، وہ اسلامی جمہوری اتحاد کو منظم کرے گی، اور مستحکم و موثر بنائے گی"۔

۱۹۷۷ سے ۱۹۹۰ تک کے ان انتخابات میں جماعت نے اس طرح حصہ لیا کہ نہ نام اس کا اپنا تھا، نہ انتخابی نشان، نہ منشور، نہ تنظیم، اور نہ تنظیم میں اسے کوئی فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی۔ سب کچھ اتحاد کا تھا، اور جماعت اتحاد، اتحاد میں شامل جماعتوں اور افراد، اور اس کی حکومت کے تمام کاموں کے لیے ذمہ دار تھی۔

حالیہ اسلامک فرنٹ کے بارہ میں جو بھی اصولی، دستوری، اور عملی اعتراضات پیدا ہوئے ہیں، یا پیدا کیے جارہے ہیں، کم و بیش یہی اعتراضات ماضی کے ان سارے اقدامات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ بظاہر تو ایک معقول آدمی کے لیے ان اشکالات کے ازالہ کے لیے یہی بات کافی ہونا چاہیے تھی کہ فرنٹ کے مثل تدبیریں بانیٔ جماعت ؒ اور ان کے معتمد ترین رفقا کے ہاتھوں، یا ان کی نگاہوں کے سامنے، اختیار کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن کیونکہ یہ اشکالات مخلص اور بہی خواہ ذہنوں میں بھی پیدا ہوئے ہیں، اس لیے فرنٹ کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو سے، امید ہے، کسی درجہ میں اطمینانِ قلب پیدا ہوسکے گا۔

یہی نہیں کہ فرنٹ کا قیام کوئی نیا فیصلہ نہیں، بلکہ یہ کسی ایسے نئے طریقِ کار کا آغاز بھی نہیں جو مولانا مودودیؒ کے بتائے ہوئے، اور ابتدا ہی سے جماعت کے اختیار کردہ، طریقِ کار سے مختلف یا منحرف ہو۔ بلکہ یہ اس ابتدائی نقشۂ کار ہی کا تسلسل، اور اس کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔

انقلاب کے لیے ہمارا اصولی طریقِ کار دو بنیادی اجزا پر مشتمل رہا ہے۔ ایک، دعوت و تبلیغ کے ذریعہ مضبوط رائے عامہ تیار اور منظم کرنا، اور ایسی عوامی، اجتماعی جدوجہد برپا کرنا جو جمہوری و آئینی ذرائع سے مطلوبہ تبدیلی لا سکے۔ دوسرے، عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک مختصر جماعت فراہم کرنا۔ تربیت یافتہ جماعت فی نفسہٖ مطلوب نہیں تھی، کہ یہ مزاج خانقاہی ہوتا۔ نہ یہ پیشِ نظر تھا کہ صرف اس کے ذریعہ مطلوبہ تبدیلی آجائے گی۔ بلکہ اس طرح ایسے کارکنوں کا

گروہ درکار تھا' جو "عوام کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ساتھ ابھار سکے' اور منظم طریقے سے ساتھ لے کر چل سکے۔"

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں : "اوّل روز سے ہمارے پیشِ نظر ایک ... اجتماعی جدوجہد برپا کرنا تھا۔ ... اس غرض کے لیے ہم اپنی کوئی الگ جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے' بلکہ ہماری خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس چیز [اصل مقصدِ وجود اور اس کے لیے جدوجہد] کا صحیح احساس پیدا ہو ... ہم نے جماعت اس وقت بنائی جب ہماری ۹ سال کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے باوجود مسلمانوں نے من حیث القوم اس راہ کو اختیار نہ کیا جسے ہم پیش کر رہے تھے" (جماعتِ اسلامی کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل' ص ۳۶ - ۳۷)

اسلامک فرنٹ نہ شارٹ کٹ کے ذریعہ مسندِ اقتدار حاصل کر لینے کی ہوس کا نتیجہ ہے' نہ غیر معمولی صبر اور حلم اور لگاتار محنت کی راہ سے فرار کا' نہ وہ ناپسندیدہ کام کرنے کے شوق کا جو جماعت میں رہ کر نہ کیے جا سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچے اور عام لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب ہونے کے لیے کہیں زیادہ صبر و حلم اور محنت درکار ہوگی۔

بنیادی طور پر' اور طویل المیعاد حکمتِ عملی کے تناظر میں' یہ توسیع و تنظیم کے ذریعہ امت کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنے مشن کی ادائیگی کے لیے متحرک و منظم کرنے کا ایک اقدام ہے۔ اور' اس لحاظ سے جماعت کے اصولی نقشۂ کار کا تسلسل اور تقاضا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد' مولانا مودودیؒ کی رہنمائی میں جماعت نے تیز رفتار توسیع اور عوامی جدوجہد کے جس مرحلہ میں دفعتاً قدم رکھ دیا تھا' فرنٹ اس مرحلہ کا تقاضا بھی ہے۔ یہ جماعت کی اس پچاس سالہ محنت کا تقاضا بھی ہے' جس کے نتیجہ میں کثیر انسانی ثمرات پیدا ہوئے ہیں' مگر وہ منتشر ہیں اور منظم ہو کر ہی ایک قوت بن سکتے ہیں۔ انتخابات کے تناظر میں' یہ اس عمل کا ناگزیر تقاضا بھی ہے جسے جماعت نے زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انتخابات آتے ہیں' جماعت وسیع تر پلیٹ فارم بنانے کے ایسے ہی کسی اقدام کو اختیار کرتی ہے۔

یہ ایک بالکل نیا اور ماضی کے اقدامات سے مختلف اقدام ہوتا تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ہم' مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں' کہہ سکتے تھے کہ "ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے' نہ کہ کسی خاص طریقے (method) سے" --- "طریقِ کار حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔" مگر اس فرنٹ کے بارے میں تو ہم ان کے وہ الفاظ دہرا سکتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۵۷ میں اسی قسم کے حالات' اعتراضات اور لٹریچر سے حوالوں کے جواب میں کہے تھے : "اصولی طریقِ کار

میں کوئی بنیادی تغیر نہیں کیا گیا... جس چیز کو تغیر کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس طریقِ کار پر عملدر آمد کی شکل بدل دی ہے۔"

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ فرنٹ کا قیام' اگر مستقل بھی ہو' جماعت کی حکمتِ عملی اور تنظیم کی ناکامی کا اعتراف نہیں ہے۔ غور کیجیے تو' اس کے برعکس' یہ اس کی کامیابی کا اعتراف ہے۔ یعنی اپنی حکمتِ عملی اور تنظیم کے نتیجہ میں جماعت اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اب وہ اپنے عام ہم خیال انسانوں کو بھی منظم کر سکتی ہے' ان کو زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے جدوجہد میں' فیصلہ سازی میں شریک کر سکتی ہے' اور جماعت کے کارکن ان کی تنظیم کی صحیح سربراہی کر سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی جماعت میں وہ افراد موجود نہیں جو عوام کو منظم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کر سکیں' اور ہماری سربراہی میں ہوتے ہوئے بھی --- محسوس ہو یا غیر محسوس --- تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ' کچے اور پکے انسانوں کی یہ تنظیم لازماً غلط راستہ پر جائے گی' غلط کام کرے گی' بے اعتبار نکلے گی' تو یہ دراصل اپنی اب تک کی حکمتِ عملی کی ناکامی کے اعتراف کے مترادف ہوگا۔ ہمیں بھی اپنی کمزوریوں کا احساس ہے' ہمیں بھی اندیشے ہیں' لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ ۵۰ سال کے بعد بھی کارکنوں کا وہ گروہ تیار نہیں ہوا جو جماعت کو عوام کی صحیح رہنمائی کے لیے مطلوب تھا' تو پھر تو اسے اپنے پورے نظام اور حکمتِ عملی پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔

فرنٹ کا مقصد منظّم توسیع ہے۔ عددی قوت میں اضافہ بھی۔ عددی قوت میں اضافہ اور اس کے اظہار (شو) کی خواہش اور کوشش غیر پسندیدہ اور مذموم چیز نہیں' بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو عین محبوب ہے۔ اور امتِ مسلمہ کے مشن کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔

دیکھیے! نصرت و فتح کو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ یہ فوج در فوج آنے والے لوگ کس معیار کے اور کتنے تربیت یافتہ تھے؟ مسلمان ماؤں کے لیے زیادہ بچے پیدا کرنے کو اس لیے پسند کیا گیا ہے تاکہ حضور اپنی امت کی تعداد پر فخر کر سکیں؟ نسلی مسلمان کس کس طرح کے ہوتے ہیں؟ قیامت کے دن بھی اپنی امت کی کثرتِ تعداد پر فخر کیا گیا۔ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ میں' قوت سے مراد' سب سے پہلے تو نفری قوت ہے۔ جب قتال کے لیے تعداد اتنی ضروری ہے' تو انتخابات کے لیے تو اور زیادہ ضروری ہوگی' جس میں

کامیابی کا انحصار ہی' اللہ کی نصرت کے بعد' اس پر ہے۔ اظہار (شو) کا معاملہ دیکھیے ۔ غزوۂ بدر میں کبھی تعداد کو آدھا دکھایا گیا' (لڑنے کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے)' کبھی دگنا' (دلوں میں رعب و ہیبت پیدا کرنے کے لیے)۔ آپ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے' تو طواف میں اکڑ کر چلنے کی سنت قائم فرمائی۔ عورتوں کو نمازِ عید میں حاضر ہونے کا حکم دیا تو یہ مصلحت بیان فرمائی کہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور شوکت کو دیکھ سکیں' اور اس میں اضافہ کا سبب بھی بنیں۔ جن کو "شو" بہت ناپسند ہے وہ یہ غور کریں کہ خود ہمارے زمانہ میں بانیٔ جماعت ؒ نے یومِ شوکتِ اسلام منایا' استقبالیے' جلوس اور مظاہرے رائج کیے' غلافِ کعبہ کا جلوس نکالا' جب کہ وہ خود ایک وقت ریزولیوشن' استقبالیوں' جلسوں اور جلوسوں کو اس تحریک کے لیے سمِ قاتل قرار دے چکے تھے۔

عددی توسیع سے استحکام اور معیار کی کمی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی خطرہ فرنٹ کے بارے میں ہے۔ یہ خطرہ حقیقی ہے۔ اگرچہ بالعموم توسیع سے معیاری افراد کی تعداد میں تو کمی نہیں ہوتی' مگر ان کے تناسب میں ضرور کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سے مجموعی معیار ہلکا پڑتا ہے' ضعف پیدا ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے سعی و ثبات مطلوب کے معیار کو' دس کے مقابلہ میں ایک سے گھٹا کر دو کے مقابلہ میں ایک' کردیا تو اسی ضعف کی طرف اشارہ فرمایا (الانفال)۔

مولانا مودودیؒ اچھی طرح جانتے تھے کہ توسیع جتنی زیادہ ہوگی' استحکام و معیار میں کمی آئے گی۔ لیکن توسیع ناگزیر ہے' کہ اس کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا : "توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ [استحکام اگر پوری طرح نہ ہوسکے' تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں]۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجیے لیکن نیوکلیس مضبوط بناتے چلے جایئے۔" فرنٹ کا قیام اسی سوچ کا مظہر ہے۔

اسی لیے کہ یہ اطمینان رہے کہ نیوکلیس مضبوط رہے گا' جماعت کے نظام میں کوئی تبدیلی پیشِ نظر نہیں ہے۔ نیوکلیس کو مضبوط رکھنے کے لیے' اور ایسے افراد کو تحریک میں ساتھ لے کر چلنے کے لیے جن کے لیے نظمِ جماعت کفایت نہیں کرتا' علیحدہ تنظیمیں بنانے' ایسی تنظیمیں بنانے جن میں نہ طریقِ کار تحریری طور پر قرآن و سنت کا پابند ہے نہ افراد کی شمولیت کے لیے کوئی معیار ہے (مثلاً ٹریڈ یونینیں)' اور ان میں جماعت کے افراد کو شریک کرنے کے' (خواہ ان تربیت یافتہ افراد کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہو)' اتنے نظائر موجود ہیں کہ ان کا ذکر ضروری نہیں۔

فرنٹ غیر تربیت یافتہ اور ایک حد تک مختلف خیال و مزاج کے لوگوں کو جماعت میں شامل کرنے کا دروازہ کھولنے کے لیے قائم نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دروازہ تو ایک حد تک اب بھی کھلا ہوا

ہے۔ فرنٹ میں شمولیت کی شرائط تقریباً وہی ہیں جو بحیثیت متفق جماعت میں شامل ہونے کے لیے ہیں۔ ایسے غیر تربیت یافتہ متفق حلقہء متفقین قائم کر کے جماعت کی پوری نمائندگی کا مقام اور اختیار حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ جماعت کے حلقوں اور شعبوں کو چلانے کے لیے ذمہ دار مقرر کیے جاتے ہیں' وہ پارلیمنٹ میں جماعت کے نمائندے بنتے ہیں' وہ جماعت کی پارلیمنٹری پارٹی کے رکن بنتے ہیں' وہ جماعت کے ترجمان پرچوں کے مدیر بنتے ہیں۔ ایسے متفق بنانے کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ۱۹۵۱ میں پنجاب کے انتخابات کے لیے پنچائتیں قائم کی گئی تھیں۔

جب جماعت میں بطور متفق داخلہ ہو سکتا ہے' تو پھر علیحدہ سے فرنٹ کا قیام کیوں ضروری سمجھا گیا؟ ہماری دانست میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس تنظیم میں شامل ہونے والے مساوی نہ ہوں' اور فیصلہ سازی میں برابر کی حیثیت کے مالک نہ ہوں' اس تنظیم کا طاقت پکڑنا مشکل ہے' اور افراد کی وابستگی بھی مضبوط نہیں ہو سکتی۔ آخر حلقہ ہائے متفقین کا وہ پروگرام کیوں اب تک کاغذ کی زینت بنا ہوا ہے جو انتخاباتِ پنجاب کے بعد وضع کیا گیا' اور جس کی اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں توثیق کی گئی! ایک وجہ شاید اس تنظیم کی نوعیت ہے۔

جماعت کے تربیت یافتہ اور چھلنیوں سے گزرے ہوئے افراد سے بھی کمزوریوں اور گناہوں کا ارتکاب ہوتا رہا ہے' فرنٹ میں شامل افراد سے بھی ہوگا۔ کچھ زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں تو مولانا مودودیؒ کا قول' قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ کہتے ہیں: میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فیصد ضمانت دیتا ہو۔ صدر اول میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب بھی یکساں نہ تھے اور نہ ان میں کوئی بشری کمزوریوں سے مبرا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ آپ حدِ کمال نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں' اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں' مگر جب عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزارہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن و سنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی حدِ اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی' جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہو جانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لیے کافی ہو۔

یہ ہے وہ بصیرت جس کے بغیر تبدیلی کی جدوجہد کامیابی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ سوال بالکل بے معنی ہے کہ کہیں فرنٹ کے شرکا سے کسی غلطی کا ارتکاب تو نہ ہو جائے گا؟ یہ مطالبہ بھی بالکل بلا جواز ہے' بلکہ دین کی بنیادی تعلیمات سے متصادم' کہ فرنٹ اپنے امیدواروں

کے اعمال و کردار کی ضمانت دے۔ فرنٹ تو کجا' خود جماعت بلکہ کسی نبی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے اعمال و کردار کی ضمانت دے۔ ہر شخص سے گناہ سرزد ہوسکتا ہے' اس کے لیے کوئی دوسرا شخص یا جماعت کیوں ذمہ وار اور جواب دہ ہو 'کس طرح ضمانت دے ؟ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی دین کا مسلّمہ بنیادی اصول ہے۔

ہاں ' ہماری اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فرنٹ یا جماعت اس بات کے لیے ذمہ وار نہیں کہ اپنے سے وابستہ افراد کو نیکی کی طرف بلائیں' نیکی پر قائم رکھنے کی کوشش کریں' جن کو امیدوار بنائیں دیکھ بھال کر بنائیں' وہ غلطی کریں تو مناسب کارروائی کریں۔ جو لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں ان کے بارہ میں کم عقلی کا شبہ تو نہیں ہوسکتا' اور کج عقلی یا بددیانتی کا گمان کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

بعض لوگ فرنٹ سے اس لیے خائف و گریزاں نظر آتے ہیں کہ کچے پکے لوگوں کی یہ تنظیم جماعت کے لیے مسائل پیدا کرے گی' لوگ طرح طرح کے کام کریں گے' بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان لوگوں کی نظر میں اب جماعت خود بھی ان مسائل کا شکار ہے' اور اس کی ساکھ گرتی جارہی ہے' ایک طرف تو اس خوف و گریز کا اطلاق ان سارے اتحادوں پر ہوتا ہے جو ماضی میں بنائے جاچکے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ بالآخر جماعت کی پارلیمنٹری پارٹی کو وسیع ہونا ہے اور اس میں غیر ارکان کی تعداد میں اضافہ ہونا ہے۔ ایک محدود سی پارٹی کے تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ پھر کیا اس خوف سے ہم پارلیمنٹری پارٹی کو وسعت دینے سے اجتناب کریں ؟ پچاس سال بعد سہی' وہ گھڑی بھی آسکتی ہے کہ جب ایک یا چند وزارتیں' یا پورا نظام ہمارے ہاتھوں میں ہو۔ یہ وزارتیں اور یہ نظام فرنٹ کے افراد سے بھی زیادہ ناپختہ' بلکہ بعض صورتوں میں مخالف و متضاد افراد پر مشتمل ہوگا۔ اپنی وزارت یا نظام کے افراد کے افعال کے لیے ہم اس سے زیادہ ذمہ وار ہوں گے جتنے جماعت کے افراد کے لیے ہیں۔ یہ افراد جو مسائل پیدا کریں گے' کیا ان کے خوف سے ہم نظام سنبھالنے ہی سے دور رہیں ؟ کیا کوئی وزارت یا نظام ہم اس وقت سنبھالیں جب اس کے سب افراد قابل اطمینان ہوں ؟

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ جماعت تمام سیاسی سرگرمیاں فرنٹ کے سپرد کردے گی' اور وہ خود دعوتی و تربیتی کاموں تک محدود ہوجائے گی۔ یہ بات اس وقت بھی صحیح نہیں تھی' اور نہ کہی گئی تھی' جب جماعت نے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے اسلامی جمہوری اتحاد کو منظم ' مستحکم اور

مؤثر بنا کر مستقل حیثیت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب بھی صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک سیاسی سرگرمیاں فرنٹ کے حوالہ کرنے اور غیر معیاری امیدوار کھڑا کرنے کا تعلق ہے' تو ' قراردادِ ماچھی گوٹھ کے تناظر میں' ایسا فرنٹ' عارضی ہو یا مستقل' "بالواسطہ" شرکت کی ایک شکل ہے۔ ماضی کے اتحاد بھی "بالواسطہ" شرکت کی شکل تھے' ورنہ ان کا قیام جائز نہ ہوتا۔ "بالواسطہ" شرکت کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ جماعت باہر کے ایسے امیدواروں کی پوری پوری حمایت کرے جو اس کے مقصد کے لیے مفید بھی ہوسکیں' اور از خود کامیاب ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ بلکہ ایسے افراد تلاش کرکے انہیں کھڑا کرے۔ ماضی کے اتحادوں میں جماعت نے خود کو' انتخابات کی حد تک' ضم کردیا تھا' اور ہر طرح کے نمائندوں کی حمایت کی تھی۔ جب کہ فرنٹ میں جماعت ہی روحِ رواں ہے' اور امیدوار کھڑا کرنے میں اس کی پسند شامل ہوگی۔

جماعت فرنٹ میں اس طرح موجود رہے گی جس طرح گلاب کے پھول میں اس کی خوشبو۔ اس تناظر میں فرنٹ کی سیاسی سرگرمیاں جماعت ہی کی مطلوبہ سرگرمیاں ہوں گی۔

پھر' ہماری نظر میں سیاست صرف انتخابات میں حصہ لینے کا نام نہیں۔ اسی لیے اگرچہ ہم نے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے جماعت کو ایک سیاسی جماعت قرار دیا' اور اس حیثیت سے رجسٹر بھی کرایا' لیکن ہمارا موقف ہمیشہ یہی رہا کہ جماعت معروف و محدود معنوں میں صرف ایک سیاسی جماعت نہیں ہے' بلکہ ایک تحریک ہے۔ سیاست کی تعریف تو طاقت کے سرچشموں پر اثر انداز ہوکر ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر کی سعی ہے۔ اس لحاظ سے جماعت کا سارا دعوتی و تربیتی کام بھی اسی مقصد پر مرکوز رہے گا۔ ان وسیع معنوں میں' صرف انتخابات میں شرکت کا کام فرنٹ کے ذریعہ کرنے کے باوجود' جو معمولاً پانچ سال میں ایک دفعہ منعقد ہونا چاہئیں' دوسری تمام سیاسی سرگرمیاں' خصوصاً دو انتخابات کی درمیانی مدت میں' جماعت ہی کرتی رہے گی۔

کچھ مسائل و اشکالات کی نوعیت عملی ہے۔ جماعت اور فرنٹ کے تعلق کی تفصیلات کیا ہوں گی؟ کیا فرنٹ کا سارا کام جماعت اور اس کے افراد ہی کو کرنا ہوگا؟ کیا یہ فرنٹ اس بات میں کامیاب ہوگا کہ جماعت کے باہر کے مطلوبہ افراد کو متحرک کرسکے؟ کیا بااثر اور ذی حیثیت افراد اس میں شامل ہوں گے؟

اس بارہ میں صحیح بات یہ ہے کہ نقشۂ کار کا مکمل' تفصیلی بلیو پرنٹ پہلے سے بنا ہوا نہ ہوسکتا ہے' نہ ہے۔ یہ تو تجربات' نتائج' حالات اور زمینی حقیقتوں کے مطابق بنتا رہے گا۔ ایک بالغ نظر قیادت میں یہ صلاحیت ضروری ہے کہ اس کے پاس ایک خاکہ اور وژن موجود ہو' اور وہ تجربات

اور حالات کی روشنی میں اس پر عملدر آمد کی شکلیں بناتی رہے' اور بدلتی رہے۔

جہاں تک امکانات کا تعلق ہے' تو تجزیہ کے بعد امید پر ہی کام شروع کیا جاتا ہے۔کامیابی کی ضمانت نہ پہلے کبھی دی جاسکی ہے' نہ اب دی جاسکتی ہے۔ نہ یہ ضروری ہے ۔ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی عقل استعمال کرکے اس کے دین کے غلبہ کے لیے اپنی دانست میں بہترین تدابیر اختیار کریں۔ کتنی مہمات ایسی تھیں جن کی کامیابی یقینی نظر آتی تھی'مگر وہ ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ کتنی ایسی ہوئیں کہ لوگ ان پر ہنستے تھے 'مگر وہ کامیاب ہوئیں۔

ہمیں کوئی فوری نتائج کی توقع نہ ہے' نہ ہونا چاہیے۔ یہ وقت طلب اور محنت طلب کام ہے۔ دروازوں کے باہر کوئی قطاریں لگی ہوئی نہیں ہیں' کہ فرنٹ بنتے ہی لوگ داخل ہونا شروع ہوجائیں گے۔ کتنے بااثر لوگ آئے ؟ یہ ہماری نظر میں اہم ضرور ہے' لیکن نہ یہ فرنٹ کی کامیابی یا ناکامی کا معیار ہوسکتا ہے' نہ آغاز کی رفتار دیکھ کر ابھی سے مستقبل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ فوری طور پر انتخابی کامیابی کے امکانات اگر امید افزا نہیں' تو انہیں فرنٹ کے کھاتہ میں ڈالنا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ فرنٹ کو تو ان ہی انتخابی امکانات پر اپنی عمارت تعمیر کرنی ہے جو جماعت نے تقریباً نصف صدی میں پیدا کیے ہیں۔ فرنٹ کی کامیابی کا بیرومیٹر تو یہ ہوگا کہ وہ نظمِ جماعت کے باہر کے کتنے افراد کو متحرک و فعال بنا سکتا ہے۔

اس مقصد میں کامیابی کے لیے' اللہ کی نصرت کے بعد ' تین چیزیں درکار ہیں ۔ ایک' ایسا پروگرام جو لوگوں کے دل کی آواز بن سکے' معاشرے میں ایک ایسی لہر پیدا کرسکے جس پر لوگ سوار ہوسکیں' اور ان کی تربیت بھی کرسکے۔ دوسرے' ایک ایسی قیادت جو لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن سکے۔ تیسرے ' ایک ایسی تنظیم جس میں لوگ مساوی حیثیت سے شریک ہوسکیں۔ فی الحال جماعت آنے والے انتخابات کے لیے تیسری چیز تیار کررہی ہے۔ اگر جماعت نے فرنٹ کو بنانے کے لیے کماحقہ محنت کی' اور پہلی دو چیزیں بھی اس نے فراہم کرلیں' تو انشاء اللہ فرنٹ کی کامیابی کے امکانات روشن ہوں گے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

اللھم وفقنا لما تحب وترضی

قومی زندگی کی متفقہ بنیادیں

اختلاف

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا، اور یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے، اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک، اور اختلاف میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ تو درکنار، ایک گھر بھی بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں، اور ایک کامیاب نظامِ زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو روکا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیری ترقی ہوئی ہے اسی وقت ہوئی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اصول پا لیے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں، اور اس اتفاق میں ایسی گنجائشیں رکھ لی گئی ہوں کہ اختلافِ طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

پاکستان میں ... جو صورتِ حال رونما ہے اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ اتفاق کی بنیادیں تلاش کرنے میں ہماری ناکامی ہے۔ ہمیں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنے کا اختیار حاصل ہوئے [تقریباً پچاس] سال گزر چکے ہیں، مگر جہاں ہم پہلے روز کھڑے تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں۔ بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے، اختیار پا کر بھی ہم ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے کوئی کامیاب اور قابل ذکر کوشش نہ کر سکے ... [ہماری سیاست اور حکومت وہی ہے]۔ انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے۔ تعلیمی نظام وہی ہے۔ معاشی نظام وہی ہے۔ اخلاق و معاشرت کا حال وہی ہے۔ مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی ہم کوئی قدم نہ اٹھا سکے، بلکہ قدم اٹھانے کے لیے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لیے ہماری سعی وجہد تو اسی غرض کے لیے تھی کہ ہم غلامی کے دور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی مؤثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں ... اختلافات کی فصلِ بہار آئی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نت نئی شان سے ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے دوسرا اس میں مزاحم ہوتا ہے، اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے کوئی تیسرا اسے بگاڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورتِ حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے تو ہمیں اختلافات اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے افاقہ پانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے ذہن کو ان بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیے جن پر سب، یا کم از کم اکثر باشندگانِ پاکستان متفق ہو سکیں، جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔

ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجوہِ نزاع کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو

جائیں۔ ذرا سا زاویہ نظر بدل جائے تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔ ہم انہیں اپنے مذہب میں پا سکتے ہیں' اپنی تہذیب اور روایات میں پا سکتے ہیں' دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں' اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

یہ سطور اسی غرض سے لکھی جا رہی ہیں کہ چند ان بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی جائے جن پر اتفاق ممکن ہے تاکہ سوچنے والے اس پر غور کریں۔

بنیادی اصول

سب سے پہلے ہم ان اصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تخریبی فضا کے بجائے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کہ اگر فضا ہی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔

اولین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیے' وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔

اختلاف اگر ایمانداری کے ساتھ ہو' دلائل کے ساتھ ہو' اور اسی حد تک رہے جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے' تو اکثر حالات میں یہ مفید ہوتا ہے' کیونکہ اس طرح مختلف نقطہ نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں۔ تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اصول اختیار کر کے اس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے' اس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے' اس کے نقطہ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے' سیاسی اختلاف ہو تو اسے غدار اور دشمن وطن ٹھہرائے' مذہبی اختلاف ہو تو اس کے پورے دین وایمان کو متہم کر ڈالے' اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے' بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکدّر

پیدا ہو جاتا ہے جو تعاون و مفاہمت کے لیے نہیں بلکہ تصادم و مزاحمت ہی کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی منفعت کا کوئی پہلو ہو تو ہو' مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس بیہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو' ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم اپنے لیے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے' اختلافات میں رواداری' ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش' اور دوسروں کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا ہے۔

کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے' لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا۔ پھر اس پر مزید خرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی' لہٰذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے۔" یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے' اختلاف کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے' اور معاشرے کے مختلف عناصر کو' جنہیں بہرحال ایک ہی جگہ رہنا ہے' اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت ومصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک مدت دراز تک معاشرے کے عناصرِ ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے' یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بدقسمتی سے نارواداری اور بدگمانی اور خود پسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں۔ حکومت اور اس کے اربابِ اقتدار اس میں مبتلا ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں۔ مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں تک اس کے زہریلے اثرات اتر گئے ہیں۔ اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں' اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور

وسعتِ ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام ان لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں، یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صَرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صَرف کرے۔

اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے، مگر اس نفی کو اس حد تک رہنا چاہیے جس حد تک وہ ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیے نہ کہ نفی۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صَرف کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ بعض لوگ تو اس منفی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں، اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اس کی اور اس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے۔ یہ نہایت غلط طریقِ کار ہے اور اس سے بڑی قباحتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے تعصبات ابھرتے ہیں۔ اس سے عام بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے، جو ایک قیادت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جانے اور دوسری کسی قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے، اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے، کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی چیز آخرکار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو مجتمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہوگا، لیکن اگر صورتِ حال یہ رہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا رہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بے سری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدۂ کلیہ کی حیثیت سے مان لینا چاہیے' یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر سے نہیں بلکہ دلائل سے منوائے' اور جو کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ بزور نافذ کرنے کے بجائے ترغیب و تلقین سے لوگوں کو راضی کرے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا ہے' اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اٹھے اور زبردستی اس کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریقِ کار کا لازمی نتیجہ کشمکش' مزاحمت اور بدمزگی ہے۔ ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی' کیونکہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے' خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا مال و دولت کی یا نفوذواثر کی' وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بس طاقت کا استعمال کافی ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے' ملکوں کے نظام تہ و بالا کر دیے ہیں' اور ان کو پرامن ارتقاء کے راستے سے ہٹاکر بے تکے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے بااثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اور اسی طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطہ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیے۔

ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا' یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا' یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی نہ کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لیے معرکہ

آرائی پر اتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کے لیے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جائے اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے جس کے برے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان، یا صوبے سے بھی اس کا تعلق ہو اس کے ساتھ اس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی، تباہ کن ثابت ہو گی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے، اور تعصب کے مقابلے میں تعصب کشمکش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھلا اس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی ہی آپس میں برسرپیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ "ملک کی بھلائی" ہی کے لیے خواہاں اور کوشاں ہوں اور دوسری شرط یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصولی ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہو گی اس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کی پرواہ نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ قزاقوں کی ٹولی ہے۔ اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار و اقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو ان کی جنگ بھی ملک کے لیے تباہ کن ہو گی اور صلح بھی۔

یہ پانچ اصول تو وہ ہیں جن کی پابندی اگر ملک کے تمام عناصر قبول نہ کریں تو یہاں سرے سے وہ فضا ہی پیدا نہیں ہو سکتی جس میں نظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتفاق ممکن ہو، یا بالفرض اس طرح کا کوئی اتفاق مصنوعی طور پر واقع ہو بھی جائے تو وہ عملاً کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مصالحانہ فضا میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ ملک کا نظامِ زندگی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اسلام

ان میں سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو ملک کے آئندہ نظام کے لیے منبع ہدایت اور اوّلین ماخذِ قانون تسلیم کیا جائے۔

اس کو بنیادِ اتفاق ہم اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور وہ اس بنیاد کے سوا کسی اور چیز پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کا عقیدہ اس کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی تہذیب اور قومی روایات اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور ان کی ماضی قریب کی تاریخ بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کے لیے یہ گوارا کرنا سخت مشکل بلکہ محال ہے کہ جس خدا اور جس رسول پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کے احکام سے وہ جان بوجھ کر منہ موڑ لیں اور اس کی ہدایات کے خلاف دوسرے طریقے اور قوانین خود اپنے اختیار سے جاری کریں۔ وہ کبھی ان طریقوں کو جاری کرنے میں سچے دل سے تعاون نہیں کر سکتے اور نہ ان قوانین کی برضاورغبت پیروی کر سکتے ہیں جن کو وہ عقیدۃً باطل اور غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر انہوں نے جان و مال اور آبرو کی ہولناک قربانیاں دیں وہ صرف یہ تھی کہ انہیں غیر اسلامی نظامِ زندگی کے تحت جینا گوارا نہ تھا اور وہ اسے اسلامی نظامِ زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ اب ان سے یہ توقع کرنا بالکل بے جا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بخوشی اس اصل مقصد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے لیے انہوں نے اتنی گراں قیمت پر آزادی خریدی ہے۔ بلاشبہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اگر کوئی جابر طاقت زبردستی انکے اس مقصد کے حصول میں مانع ہو جائے اور ان پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ حیات مسلط کر دے تو وہ اسی طرح مجبوری کے ساتھ اسے برداشت کر لیں جس طرح انگریزی تسلط واقع ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے برداشت کیا تھا' لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایک ناراضمند آبادی پر جبر سے ایک نظام مسلط کر کے اسے کامیابی کے ساتھ چلایا بھی جا سکتا ہے وہ یقیناً سخت نادان ہے۔

جن لوگوں کو اس بنیاد سے اتفاق نہیں ہے وہ چار طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ایک' وہ مسلمان جو اخلاق' تہذیب اور معاشرت میں اس حد تک مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انہیں اسلامی طرزِ زندگی کی طرف پلٹنے کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دوسرے' وہ مسلمان جو مسلمان ہونے سے تو منکر نہیں مگر مغربی افکار و نظریات سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ

انہیں اب اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص رجحانات کے سبب سے ایک لادینی (سیکولر) نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں' کیونکہ وہی ان کے مزاج ونداق سے مناسبت رکھتا ہے۔ تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں۔ اور چوتھے طبقے میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں جو مسلمانوں کے دینی نظام کی بہ نسبت ایک غیردینی نظام کو ترجیح دیتی ہیں۔

ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ اب کیا یہ انصاف ہے کہ ملک کا نظام اس بنیاد پر تو تعمیر نہ ہو جسے کروڑوں آدمی چاہتے ہیں اور اس بنیاد پر تعمیر ہو جسے چاہنے والے چند ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں ؟ اور اگر بالفرض ایسا کیا بھی جائے تو کون سی طاقت ایسے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ان کروڑوں آدمیوں کا قلبی تعاون حاصل کرے گی ؟ ہم ان حضرات سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے خیالات کو یک لخت تبدیل کر دیں۔ البتہ جو بات ہم ان سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ملک کی بھلائی ایسی ہی بنیادوں پر اس کا نظامِ زندگی تعمیر کرنے میں ہے جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق ممکن ہو' اور یہ اتفاق بہرحال لادینی پر یا قرآن بلا سنت پر ممکن نہیں ہے' لہٰذا آپ اپنے خیالات جو کچھ بھی چاہیں رکھیں' مگر مزاحمت چھوڑ دیں۔

رہے ہمارے غیر مسلم ہم وطن' تو انہیں پہلے بھی بارہا اطمینان دلایا جا چکا ہے' اور اب بھی یہ اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ مسلمانوں کا مذہب آپ پر مسلط نہیں کیا جائے گا' آپ کے مذہب اور تہذیب میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی' آپ کا پرسنل لا آپ کے لیے محفوظ رہے گا' اور آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہاں عملاً اس سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے جو دنیا میں کہیں اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ مطالبہ آخر کس بنا پر حق بجانب ہو سکتا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کی مرضی کے بجائے اقلیت کی مرضی کے مطابق بنے ؟ اور اگر یہاں آپ کے مذہبی قوانین کو رائج نہیں ہونا ہے تو آپ کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے کہ یہاں کے ملکی قوانین اسلامی قانون کے اصولوں پر بنیں یا رومن لا کے اصولوں پر ؟ آپ کے لیے دونوں یکساں اجنبی ہیں' پھر کس بنا پر آپ ان میں سے ایک کے مخالف اور دوسرے کے طالب ہیں ؟

قرآن و سنت کو بنیاد بنانے کے خلاف ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کی تعبیروں میں بکثرت اختلافات ہیں اور کوئی ایک تعبیر متفق علیہ نہیں ہے۔ رہی سنت' تو اس میں صرف

تعبیرات ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر ملک کی آبادی کا کثیر حصہ متفق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی خاص تعبیر کو نہیں بلکہ بجائے خود قرآن کو، اور سنت کے متعلق کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ خود سنتِ رسول اللہ کو نظامِ زندگی کی بنیاد قرار دے رہے ہیں، اور یہ بنیاد ایک ناقابلِ لحاظ اقلیت کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ رہے اختلافات، تو وہ دو طریقوں سے بآسانی حل ہو سکتے ہیں:

اوّل یہ کہ مسلمانوں میں جو گروہ معتدبہ تعداد میں پائے جاتے ہیں (مثلاً حنفی، اہلِ حدیث، شیعہ) ان سے تعلق رکھنے والے معاملات پر قرآن کی اسی تعبیر اور سنت کی اسی تشریح کا اطلاق ہو جو ان کے نزدیک مسلّم ہو۔

دوم یہ کہ جو معاملات تمام ملک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں وہ تعبیر و تشریح عملاً کی جائے جس پر اکثریت متفق ہو، اور اقلیت کے لیے یہ حق رہے کہ وہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اکثریت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

جمہوریت

دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہو سکتا ہے، "جمہوریت" ہے۔ یہ خود قرآن و سنت کا منشا بھی ہے، اور باشندگان ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ:

> ملک کسی خاص شخص، یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں، لہٰذا اس کا انتظام ان سب کی، یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے، اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے حکمراں اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کر سکیں۔

اس تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کی بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بحث اس کی کسی خاص شکل میں نہیں، بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی یہاں اختیار کی جاتی ہے اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔

اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگانِ ملک کی نہیں' بلکہ کسی خاص طبقے کی' مرضی کو غلبہ حاصل ہو' تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے' اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں ہے' اور نہ یہی ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔ ایسے نظام سے اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو اسی طبقے کو ہو سکتی ہے جس کی مرضی اس میں غالب ہو' اور ایک محدود طبقے کی دلچسپی نہ صرف یہ کہ ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دلچسپی کی ضد ہوتی چلی جاتی ہے' یہاں تک کہ یہ تضاد ایک کشمکش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اس نقصان دہ صورت حال میں مبتلا ہونے سے ملک کو بچانا ضروری ہے' اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں' پہلے جمہوریت کے اصول کو صدقِ دل سے قبول کر لیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک کارفرما ہو۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں۔ اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جب کہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو' ذہنی انتشار موجود ہو' اخلاق کمزور ہو' اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی' نسلی' صوبائی' اور گروہی مفاد کو عزیز رکھتے ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی' یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے' اور اسے بحیثیتِ مجموعی ایک بالغ قوم بنانے' کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جب کہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سے کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے' مگر تجربات کی درسگاہ بالآخر اسے سب کچھ سمجھا دیتی ہے' اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے' وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امرِ واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے بھلے برے کی وہ خود ذمہ دار ہے' اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر

ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی۔ لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔

علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے' ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے' اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو' خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹرشپ یا اشرافیت' اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں' اور جب ان حالات کے ردوبدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں' انہیں اس نقصانِ عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں' تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے' جمہوریت کی طرف پھرپلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پرامن طریقے سے ہی قائم ہو' بہرحال پرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی۔ اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداء آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں' بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو ---- جمہور کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی ---- اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے ان نتائج کو قبول کرنے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں ؟

آمریت خواہ کتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں' اور ان

خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردّوبدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے۔ جنہیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آ سکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو' انجامِ کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی' اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر خلاصی کے جتنے بھی پر امن راستے ہوتے ہیں وہ انہیں چن چن کر بند کر دیتی ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزلِ خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

ان نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا۔ خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل ہو رہا ہو۔

جمہوریت کی زندگی اور کامیابی کے لیے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ حکومت کے کارپرداز اور محافظ سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو تسلیم کریں۔ یعنی وہ اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں اور مملکت کے کارپردازوں کا (جو حقیقت میں باشندوں ہی کے ملازم ہیں) یہ فرض ہے کہ جن لوگوں کو بھی باشندوں نے کارفرما بنایا ہو اس کے تحتِ امر رہ کر کام کریں۔ یہ بات اگر ایمانداری کے ساتھ قبول نہ کی جائے اور ملازمینِ حکومت جتھہ بندی کر کے خود یہ طے کرنے لگیں کہ کون کار فرما ہو اور کون نہ ہو یا کارفرمائی کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں لے لینے پر تل جائیں' تو صرف یہی نہیں کہ جمہوریت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی' بلکہ درحقیقت اخلاقی حیثیت سے یہ ایک بہت بڑی خیانت' اور نتائج کے اعتبار سے پورے ملک کے لیے ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ ایک شخص کے ملازم اگر جتھہ بندی کر کے خود اس شخص کو مغلوب کر لیں اور اس کے گھربار کے مالک بن بیٹھیں تو اس کا نام غداری و خیانت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پھر جہاں پبلک کے ملازم پبلک کے ساتھ یہ معاملہ کریں وہاں اس حرکت کو اور کیا نام دیا جائے گا؟

رہے اس کے نتائج تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ جہاں ایک مرتبہ ملازمین کو یہ چسکا لگ گیا وہاں ایک جتھہ نہیں' بہت سے حوصلہ مند جتھے وجود میں آئیں گے' ایک دوسرے کے مقابلے میں اقتدار کے لیے کشمکش شروع کریں گے' نیچے سے اوپر تک سب سازشوں اور جوڑتوڑ میں لگ جائیں گے' اور یہ ساری اکھیڑ پچھاڑ جمہوری انتخابات کے کھلے میدان میں نہیں بلکہ پس پردہ دفتروں اور درباروں میں ہو گی۔ اس صورتحال میں نظم و نسق کا تباہ ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہمارے ملک کو بہت سے مسائل درپیش ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لوگوں کی اخلاقی و دینی حالت درست کرنی ہے۔ معاشی بدحالی کا علاج کرنا ہے۔ عام جہالت کو دور کرنا ہے۔ نظامِ تعلیم کی اصلاح کرنی ہے اور ایسے ہی بہت سے مسائل ہیں۔ لیکن ان سب سے مقدّم یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتفاق کر لیں' اور یہ اتفاق صحیح بنیادوں پر ہو۔ کیونکہ جب تک یہ نہ ہو گا' ہم اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے نہ تو کوئی لائحہ عمل بنا سکیں گے' اور نہ یہی ممکن ہو گا کہ کسی لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لیے ہماری قومی زندگی کے تمام عناصر اور وسائل مجتمع ہو کر کام کر سکیں۔

(اشارات' ترجمان القرآن' جلد ۴۴' عدد ۵)

بقیہ: رسائل و مسائل

اسلامی ختم ہو گئی" --- "اس کا معیار تباہ ہو گیا" --- "اس میں کوئی نظامِ تربیت نہیں" --- "یہ منہ اور اقامتِ دین کا دعویٰ" ' خواہ باقی ۹۹۹۹ ارکان ' تمام ترغیبات کے باوجود 'پاک نفس ہوں۔

یہ غلو فی الدین' تعمق اور تشدّد ہے۔ ہم نے غیر دینی اور غیر فطری تصوّرات اور معیار قائم کر لیے ہیں' اور ان مخمصوں میں پھنس گئے ہیں جن میں نہ انبیا مبتلا ہوئے' نہ ہمارے سلف صالحین۔ اس طرح ہم انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو دین کے لیے جدوجہد میں شریک کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ اسی کے ازالہ کے لیے میں نے اپنی بات کہی تھی۔

آپ میری ان گزارشات کی روشنی میں غور کریں تو امید ہے آپ پر میری بات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ (خ ۔ م)

شہادتِ امام حسینؓ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مقصدِ شہادت

ہر سال محرم میں کروڑوں مسلمان شیعہ بھی اور سنی بھی ' امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان غم گساروں میں سے بہت ہی کم لوگ اس مقصد کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کے لیے امام نے نہ صرف اپنی جانِ عزیز قربان کی بلکہ اپنے کنبے کے بچوں تک کو کٹوایا۔ کسی شخص کی مظلومانہ شہادت پر اس کے اہلِ خاندان کا' اور اس خاندان سے محبت و عقیدت یا ہمدردی رکھنے والوں کا اظہارِ غم کرنا تو ایک فطری بات ہے۔ ایسا رنج و غم دنیا کے ہر خاندان اور اس سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی کوئی اخلاقی قدروقیمت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اس شخص کی ذات کے ساتھ اس کے رشتہ داروں کی اور خاندان کے ہمدردوں کی محبت کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ امام حسینؓ کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ۱۳۲۰ برس گزر جانے پر بھی ہر سال ان کا تازہ غم ہوتا رہے ؟

اگر یہ شہادت کسی مقصدِ عظیم کے لیے نہ تھی تو محض ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر صدیوں اس کا غم جاری رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اور خود امام کی اپنی نگاہ میں اس محض ذاتی و شخصی محبت کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے ؟ انہیں اگر اپنی ذات اس مقصد سے زیادہ عزیز ہوتی تو وہ اسے قربان ہی کیوں کرتے ؟ ان کی یہ قربانی تو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس مقصد کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر ہم اس مقصد کے لیے کچھ نہ کریں' بلکہ اس کے خلاف کام کرتے رہیں' تو محض ان کی ذات کے لیے گریہ و زاری کر کے' اور ان کے قاتلوں پر

لعن طعن کر کے قیامت کے روز نہ تو ہم امام ہی سے کسی داد کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اور نہ یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان کا خدا اس کی کوئی قدر کرے گا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ وہ مقصد کیا تھا؟ کیا امام تخت و تاج کے لیے اپنے کسی ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی؟ کوئی شخص بھی جو امام حسینؓ کے گھرانے کی بلند اخلاقی سیرت کو جانتا ہے' یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ اپنی ذات کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں میں خوں ریزی کر سکتے تھے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کا نظریہ ہی صحیح مان لیا جائے جن کی رائے میں یہ خاندان حکومت پر اپنے ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتا تھا' تب بھی حضرت ابوبکرؓ سے لے کر امیر معاویہؓ تک' پچاس برس کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حکومت حاصل کرنے کے لیے لڑنا اور کشت و خون کرنا ہرگز ان کا مسلک نہ تھا۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ امام عالی مقام کی نگاہیں اس وقت مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست کی روح اور اس کے مزاج اور اس کے نظام میں کسی بڑے تغیر کے آثار دیکھ رہی تھیں جسے روکنے کی جدوجہد کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا' حتیٰ کہ اس راہ میں لڑنے کی نوبت بھی آ جائے تو نہ صرف جائز بلکہ فرض سمجھتے تھے۔

ریاست کے مزاج' مقصد اور دستور کی تبدیلی

وہ تغیر کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اپنا دین نہیں بدل دیا تھا۔ حکمرانوں سمیت سب لوگ خدا اور رسولؐ اور قرآن کو اسی طرح مان رہے تھے جس طرح پہلے مانتے تھے۔ مملکت کا قانون بھی نہیں بدلا تھا۔ عدالتوں میں قرآن اور سنت ہی کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے بنی امیہ کی حکومت میں بھی ہو رہے تھے جس طرح ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ بلکہ قانون میں تغیر تو انیسویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا کی مسلم حکومتوں میں سے کسی کے دور میں بھی نہیں ہوا۔ بعض لوگ یزید کے شخصی کردار کو بہت نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں جس سے یہ عام غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تغیر جسے روکنے کے لیے امام کھڑے ہوئے تھے' بس یہ تھا کہ ایک برا آدمی برسر اقتدار آ گیا تھا۔ لیکن یزید کی سیرت و شخصیت کا جو برے سے برا تصور پیش کرنا ممکن ہے اسے جوں کا توں مان لینے کے بعد بھی یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ اگر نظام صحیح بنیادوں پر قائم ہو تو محض ایک برے آدمی کا برسرِاقتدار آ جانا کوئی ایسی بڑی بات ہو سکتی ہے جس پر امام حسینؓ جیسا دانا و زیرک اور علمِ شریعت میں گہری نظر رکھنے والا شخص بے صبر ہو جائے۔ اس لیے یہ شخصی معاملہ بھی وہ اصل تغیر نہیں ہے جس نے امامؑ کو بے چین کیا تھا۔

تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو چیز واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتدا ہو رہی تھی وہ اسلامی ریاست کے دستور' اور اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے پورے نتائج اگرچہ اس وقت سامنے نہ آئے تھے۔ لیکن ایک صاحبِ نظر آدمی گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی یہ جان سکتا ہے کہ اب اس کا راستہ بدل رہا ہے' اور جس راہ پر یہ مڑ رہی ہے وہ آخر کار اسے کہاں لے جائے گا۔ یہی رخ کی تبدیلی تھی جسے امام نے دیکھا اور گاڑی کو پھر سے صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لیے جان لڑا دینے کا فیصلہ کیا۔

نقطۂ انحراف

اس چیز کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کی سربراہی میں ریاست کا جو نظام چالیس سال تک چلتا رہا تھا اس کے دستور کی بنیادی خصوصیات کیا تھیں' اور یزید کی ولی عہدی سے مسلمانوں میں جس دوسرے نظامِ ریاست کا آغاز ہوا اس کے اندر کیا خصوصیات دولتِ بنی امیہ و بنی عباس اور بعد کی بادشاہیوں میں ظاہر ہوئیں ۔ اسی تقابل سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ یہ گاڑی پہلے کس لائن پر چل رہی تھی' اور اس نقطۂ انحراف پر پہنچ کر آگے وہ کس لائن پر چل پڑی۔ اور اسی تقابل سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی آغوش میں تربیت پائی تھی' اور جس نے صحابہؓ کی بہترین سوسائٹی میں بچپن سے بڑھاپے تک کی منزلیں طے کی تھیں' وہ کیوں اس نقطۂ انحراف کے سامنے آتے ہی گاڑی کو اس نئی لائن پر لے جانے سے روکنے کے لیے کھڑا ہو گیا' اور کیوں اس نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی کہ اس زور دار گاڑی کا رخ موڑنے کے لیے اس کے آگے کھڑے ہو جانے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

انسانی بادشاہی کا آغاز

اسلامی ریاست کی اوّلین خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف زبان ہی سے یہ نہیں کہا جاتا تھا بلکہ سچے دل سے یہ مانا بھی جاتا تھا' اور عملی رویہ سے اس عقیدہ و یقین کا پورا ثبوت بھی دیا جاتا تھا کہ ملک خدا کا ہے' باشندے خدا کی رعیت ہیں' اور حکومت اس رعیت کے معاملے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ حکومت اس رعیت کی مالک نہیں ہے۔ اور رعیت اس کی غلام نہیں ہے۔ حکمرانوں کا کام سب سے پہلے اپنی گردن میں خدا کی بندگی و غلامی کا قلادہ ڈالنا ہے' پھر یہ

ان کی ذمہ داری ہے کہ خدا کی رعیت پر اس کا قانون نافذ کریں۔ لیکن یزید کی ولی عہدی سے جس انسانی بادشاہی کا مسلمانوں میں آغاز ہوا ' اس میں خدا کی بادشاہی کا تصور صرف زبانی اعتراف تک محدود رہ گیا۔ عملاً اس نے وہی نظریہ اختیار کر لیا جو ہمیشہ سے ہر انسانی بادشاہی کا رہا ہے ' یعنی ملک بادشاہ اور شاہی خاندان کا ہے اور وہ رعیت کی جان ' مال ' آبرو ' ہر چیز کا مالک ہے۔ خدا کا قانون ان بادشاہتوں میں نافذ ہوا بھی تو صرف عوام پر ہوا ' بادشاہ اور ان کے خاندان اور امراء اور حکام زیادہ تر اس سے مستثنیٰ ہی رہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعطل

اسلامی ریاست کا مقصد خدا کی زمین میں ان نیکیوں کو قائم کرنا اور فروغ دینا تھا جو خدا کو محبوب ہیں۔ اور ان برائیوں کو دبانا اور مٹانا تھا جو خدا کو ناپسند ہیں۔ مگر انسانی بادشاہت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد حکومت کا مقصد فتحِ ممالک اور تسخیرِ خلائق اور تحصیلِ باج و خراج اور عیشِ دنیا کے سوا کچھ نہ رہا۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت بادشاہوں نے کم ہی کبھی انجام دی۔ ان کے ہاتھوں اور ان کے امراء اور حکام اور درباریوں کے ہاتھوں بھلائیاں کم اور برائیاں بہت زیادہ پھیلیں۔ بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کی روک تھام اور اشاعتِ دین اور علومِ اسلامی کی تحقیق و تدوین کے لیے جن اللہ کے بندوں نے کام کیا انھیں حکومتوں سے مدد ملنی تو درکنار اکثر وہ حکمرانوں کے غضب ہی میں گرفتار رہے اور اپنا کام وہ ان کی مزاحمتوں کے علی الرغم ہی کرتے رہے۔ ان کی کوششوں کے برعکس حکومتوں اور ان کے حکام و متوسلین کی زندگیوں اور پالیسیوں کے اثرات مسلم معاشرے کو پیہم اخلاقی زوال ہی کی طرف لے جاتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسلام کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا ' جس کی بدترین مثال بنوامیہ کی حکومت میں نومسلموں پر جزیہ لگانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

اسلامی ریاست کی روح تقویٰ اور خدا ترسی اور پرہیزگاری کی روح تھی جس کا سب سے بڑا مظہر خود ریاست کا سربراہ ہوتا تھا۔ حکومت کے عمّال اور قاضی اور سپہ سالار ' سب اس روح سے سرشار ہوتے تھے ' اور پھر اسی روح سے وہ پورے معاشرے کو سرشار کرتے تھے ' لیکن بادشاہی کی راہ پر پڑتے ہی مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں نے قیصر و کسریٰ کے سے رنگ ڈھنگ اور ٹھاٹھ باٹھ اختیار کر لیے۔ عدل کی جگہ ظلم و جور کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ پرہیزگاری کی جگہ فسق و فجور اور راگ رنگ اور عیش و عشرت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حرام و حلال کی تمیز سے حکمرانوں کی سیرت و کردار خالی ہوتی چلی گئی۔ سیاست کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹتا چلا گیا۔

خدا سے خود ڈرنے کے بجائے حاکم لوگ بندگان خدا کو اپنے آپ سے ڈرانے لگے۔ اور لوگوں کے ایمان و ضمیر بیدار کرنے کے بجائے ان کو اپنی بخششوں کے لالچ سے خریدنے لگے۔

اسلامی دستور کے بنیادی اصول

یہ تو تھا روح و مزاج اور مقصد اور نظریے کا تغیر ــــ ایسا ہی تغیر اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں میں بھی رونما ہوا۔ اس دستور کے سات اہم ترین اصول تھے جن میں سے ہر ایک کو بدل ڈالا گیا۔

۱۔ آزادانہ انتخاب

دستورِ اسلامی کا سنگِ بنیاد یہ تھا کہ حکومت لوگوں کی آزادانہ رضا مندی سے قائم ہو۔ کوئی شخص اپنی کوشش سے اقتدار حاصل نہ کرے بلکہ لوگ اپنے مشورے سے بہتر آدمی کو چن کر اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اس کا سبب ہو۔ بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش یا سازش کا دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہوں۔ جب تک کسی شخص کو بیعت حاصل نہ ہو وہ برسرِ اقتدار نہ آئے اور جب لوگوں کا اعتماد اس پر سے اٹھ جائے تو وہ اقتدار سے چمٹا نہ رہے۔ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔ امیر معاویہؓ کے معاملے میں پوزیشن مشتبہ ہو گئی۔ اس لیے صحابی ہونے کے باوجود ان کا شمار خلفائے راشدینؓ میں نہیں کیا گیا۔ لیکن آخر کار یزید کی ولی عہدی وہ انقلابی کارروائی ثابت ہوئی جس نے اس قاعدے کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس سے خاندانوں کی موروثی بادشاہتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد سے آج تک پھر مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ اب لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِاقتدار آنے لگے۔ اب بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل کی جانے لگی۔ اب بیعت کرنے یا نہ کرنے میں لوگ آزاد نہ رہے۔ اور بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قائم رہنے کے لیے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اوّل تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار تھا اس کی بیعت نہ کرتے۔ لیکن اگر وہ بیعت نہ کرتے تو جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا تھا۔ وہ ہٹنے والا نہ تھا۔ اسی جبری بیعت کو کالعدم قرار دینے کا قصور جب منصور عباسی کے زمانہ میں امام مالکؒ سے سرزد ہوا تو ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے اور ان

کے ہاتھ شانوں سے اکھڑوا دیے گئے۔

۲- شورائی نظام

دوسرا اہم ترین قاعدہ اس دستور کا یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جن کے علم' تقویٰ اور اصابتِ رائے پر عام لوگوں کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جو لوگ شوریٰ کے رکن بنائے گئے' اگرچہ ان کو انتخابِ عام کے ذریعہ سے منتخب نہیں کرایا گیا تھا۔ جدید زمانے کے تصوّر کے لحاظ سے وہ نامزد کردہ لوگ ہی تھے۔ لیکن خلفاء نے یہ دیکھ کر ان کو مشیر نہیں بنایا تھا کہ یہ ہماری ہاں میں ہاں ملانے' اور ہمارے مفاد کی خدمت کرنے کے لیے موزوں ترین لوگ ہیں۔ بلکہ انہوں نے پورے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ قوم کے بہترین عناصر کو چنا تھا جن سے وہ حق گوئی کے سوا کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے' جن سے یہ امید تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنے علم و ضمیر کے مطابق بالکل صحیح ایماندارانہ رائے دیں گے' جن سے کوئی شخص بھی یہ اندیشہ نہ رکھتا تھا کہ وہ حکومت کو کسی غلط راہ پر جانے دیں گے۔ اگر اس وقت ملک میں آج کل کے طریقے کے مطابق انتخابات بھی ہوتے تو عام مسلمان انہی لوگوں کو اپنے اعتماد کا مستحق قرار دیتے۔ لیکن شاہی دور کا آغاز ہوتے ہی شوریٰ کا یہ طریقہ بدل گیا۔ اب بادشاہ استبداد اور مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے لگے۔ اب شاہزادے اور خوشامدی اہلِ دربار' اور صوبوں کے گورنر اور فوجوں کے سپہ سالار ان کی کونسل کے ممبر تھے۔ اب وہ لوگ ان کے مشیر تھے جن کے معاملہ میں اگر قوم کی رائے لی جاتی تو اعتماد کے ایک ووٹ کے مقابلہ میں لعنت کے ہزار ووٹ آتے۔ اور اس کے برعکس وہ حق شناس و حق گو اہلِ علم و تقویٰ جن پر قوم کو اعتماد تھا وہ بادشاہوں کی نگاہ میں کسی اعتماد کے مستحق نہ تھے' بلکہ الٹے معتوب یا کم از کم مشتبہ تھے۔

۳- اظہارِ رائے کی آزادی

اس دستور کا تیسرا اصول یہ تھا کہ لوگوں کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی ہو۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اسلام نے ہر مسلمان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کے صحیح راستہ پر چلنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ لوگوں کا ضمیر اور ان کی زبانیں آزاد ہوں' وہ ہر غلط کام پر بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافتِ راشدہ میں صرف یہی نہیں کہ لوگوں کا یہ حق پوری طرح محفوظ تھا' بلکہ خلفائے راشدینؓ

اسے ان کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کے ادا کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کی مجلسِ شوریٰ کے ممبروں ہی کو نہیں، قوم کے ہر شخص کو بولنے اور ٹوکنے اور خود خلیفہ سے باز پرس کرنے کی مکمل آزادی تھی، جس کے استعمال پر لوگ ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں بلکہ داد اور تعریف سے نوازے جاتے تھے۔ یہ آزادی ان کی طرف سے کوئی عطیہ اور بخشش نہ تھی جس کے لیے وہ قوم پر اپنا احسان جتاتے، بلکہ یہ اسلام کا عطا کردہ ایک دستوری حق تھا جس کا احترام کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اسے بھلائی کے لیے استعمال کرنا ہر مسلمان پر خدا اور رسول کا عائد کردہ ایک فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لیے معاشرے اور ریاست کی فضا کو ہر وقت سازگار رکھنا ان کی نگاہ میں فرائض خلافت کا ایک اہم جز تھا۔ لیکن بادشاہی دور کا آغاز ہوتے ہی ضمیروں پر قفل چڑھا دیے گئے اور منہ بند کر دیے گئے۔ اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ زبان کھولو تو تعریف میں کھولو، ورنہ چپ رہو۔ اور اگر تمہارا ضمیر ایسا زور آور ہے کہ حق گوئی سے تم باز نہیں رہ سکتے تو قید یا قتل کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ پالیسی رفتہ رفتہ مسلمانوں کو پس ہمت، بزدل اور مصلحت پرست بناتی چلی گئی۔ خطرہ مول لے کر سچی بات کہنے والے ان کے اندر کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ خوشامد اور چاپلوسی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی و راست بازی کی قیمت گرتی چلی گئی۔ اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ایماندار اور آزاد خیال لوگ حکومت سے بے تعلق ہو گئے۔ اور عوام کا حال یہ ہو گیا کہ کسی شاہی خاندان کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ ایک کو ہٹانے کے لیے جب دوسرا آیا تو انہوں نے مدافعت میں انگلی تک نہ ہلائی اور گرنے والا جب گرا تو انہوں نے ایک لات اور رسید کر کے اسے زیادہ گہرے گڑھے میں پھینکا۔ حکومتیں جاتی اور آتی رہیں، مگر لوگوں نے تماشائی سے بڑھ کر اس آمدورفت کے منظر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

۴- خدا اور خلق کے سامنے جواب دہی

چوتھا اصول، جو اس تیسرے اصول کے ساتھ لازمی تعلق رکھتا تھا، یہ تھا کہ خلیفہ اور اس کی حکومت خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ جہاں تک خدا کے سامنے جواب دہی کا تعلق ہے اس کے شدید احساس سے خلفائے راشدینؓ پر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو گیا تھا۔ اور جہاں تک خلق کے سامنے جواب دہی کا تعلق ہے، وہ ہر وقت، ہر جگہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ ان کی حکومت کا یہ اصول نہ تھا کہ صرف مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) میں نوٹس دے کر ہی ان سے سوال کیا جا سکتا ہے، وہ ہر روز پانچ مرتبہ نماز کی

جماعت میں اپنے عوام کا سامنا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے جمعہ کی جماعت میں عوام کے سامنے اپنی کہتے اور ان کی سنتے تھے۔ وہ شب و روز بازاروں میں کسی باڈی گارڈ کے بغیر، کسی ہٹو بچو کی آواز کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان کے گورنمنٹ ہاؤس (یعنی ان کے کچے مکان) کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا اور ہر ایک ان سے مل سکتا تھا۔ ان سب مواقع پر ہر شخص ان سے سوال کر سکتا تھا اور جواب طلب کر سکتا تھا۔ یہ محدود جواب دہی نہ تھی بلکہ کھلی اور ہمہ وقتی جواب دہی تھی۔ یہ نمائندوں کے واسطہ سے نہ تھی بلکہ پوری قوم کے سامنے براہ راست تھی۔ وہ عوام کی مرضی سے برسرِاقتدار آئے تھے اور عوام کی مرضی انہیں ہٹا کر دوسرا خلیفہ ہر وقت لا سکتی ہے۔ اس لیے نہ تو انہیں عوام کا سامنا کرنے میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا اور نہ اقتدار سے محروم ہونا ان کی نگاہ میں کوئی خطرہ تھا کہ وہ اس سے بچنے کی کبھی فکر کرتے۔ لیکن بادشاہی دور کے آتے ہی جوابدہ حکومت کا تصوّر ختم ہو گیا۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا خیال چاہے زبانوں پر رہ گیا ہو، مگر عمل میں اس کے آثار کم ہی نظر آتے ہیں۔ رہی خلق کے سامنے جواب دہی، تو کون مائی کا لال تھا جو ان سے جواب طلب کر سکتا۔ وہ اپنی قوم کے فاتح تھے۔ مفتوحوں کے سامنے کون فاتح جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ طاقت سے برسرِاقتدار آئے تھے اور ان کا نعرہ یہ تھا کہ جس میں طاقت ہو وہ ہم سے اقتدار چھین لے۔ ایسے لوگ عوام کا سامنا کب کیا کرتے ہیں اور عوام ان کے قریب کہاں پھٹک سکتے تھے۔ وہ نماز بھی پڑھتے تھے تو نحو خیرے کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے محلوں کی محفوظ مسجدوں میں، یا باہر اپنے نہایت قابلِ اعتماد محافظوں کے جھرمٹ میں۔ ان کی سواریاں نکلتی تھیں تو آگے اور پیچھے مسلح دستے ہوتے تھے اور راستے صاف کر دیے جاتے تھے۔ عوام کی اور ان کی مڈبھیڑ کسی جگہ ہوتی ہی نہ تھی۔

۵ - بیت المال ---- ایک امانت

پانچواں اصول اسلامی دستور کا یہ تھا کہ بیت المال خدا کا مال اور مسلمانوں کی امانت ہے، جس میں کوئی چیز حق کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے آنی نہ چاہیے، اور جس میں سے کوئی چیز حق کے سوا کسی دوسری راہ میں جانی نہ چاہیے۔ خلیفہ کا حق اس مال میں اتنا ہی ہے جتنا قرآن کی رو سے مالِ یتیم میں اس کے ولی کا ہوتا ہے کہ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (جو اپنے ذاتی ذرائع آمدنی اپنی ضرورت بھر رکھتا ہو وہ اس مال سے تنخواہ لیتے ہوئے شرم کرے، اور جو واقعی حاجت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے جسے ہر معقول آدمی مبنی برانصاف مانے)۔ خلیفہ اس کی ایک ایک پائی کے آمد و خرچ پر حساب دینے کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو

اس سے حساب مانگنے کا پورا حق ہے۔ خلفائے راشدین نے اس اصول کو بھی کمال درجہ دیانت اور حق شناسی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ ان کے خزانے میں جو کچھ بھی آتا تھا ٹھیک اسلامی قانون کے مطابق آتا تھا اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہوتا تھا بالکل جائز راستوں میں ہوتا تھا۔ ان میں سے جو غنی تھا اس نے ایک حبہ اپنی ذات کے لیے تنخواہ کے طور پر وصول کیے بغیر مفت خدمت انجام دی' بلکہ اپنی گرہ سے قوم کے لیے خرچ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ اور جو تنخواہ کے بغیر ہمہ وقتی خدمت گار نہ بن سکتے تھے' انہوں نے اپنی ضروریات زندگی کے لیے اتنی کم تنخواہ لی کہ ہر معقول آدمی اسے انصاف سے کم ہی مانے گا' زیادہ کہنے کی جرات ان کا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ پھر اس خزانے کی آمد و خرچ کا حساب ہر وقت ہر شخص مانگ سکتا تھا اور وہ ہر وقت ہر شخص کے سامنے حساب دینے کے لیے تیار تھے۔ ان میں سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں پوچھ سکتا تھا کہ خزانے میں یمن سے جو چادریں آئی ہیں ان کا طول و عرض تو اتنا نہ تھا کہ جناب کا یہ لمبا کرتہ بن سکے' یہ زائد کپڑا آپ کہاں سے لائے ہیں؟ مگر جب خلافت بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو خزانہ خدا اور مسلمانوں کا نہیں بلکہ بادشاہ کا مال تھا' ہر جائز و ناجائز راستے سے اس میں دولت آتی تھی اور جائز و ناجائز راستے میں بے غل و غش صرف ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حساب کا سوال اٹھا سکے۔ سارا ملک ایک خوانِ یغما تھا جس پر ایک ہرکارے سے لے کر سربراہ مملکت تک' حکومت کے سارے کل پرزے حسبِ توفیق ہاتھ مار رہے تھے' اور ذہنوں سے یہ تصور ہی نکل گیا تھا کہ اقتدار کوئی پروانۂ اباحت نہیں ہے جس کی بدولت یہ لوٹ مار ان کے لیے حلال ہو' اور پبلک کا مال کوئی شیرِ مادر نہیں ہے جسے وہ ہضم کرتے رہیں اور کسی کے سامنے انہیں اس کا حساب دینا نہ ہو۔

۶۔ قانون کی حکومت

چھٹا اصول اس دستور کا یہ تھا کہ ملک میں قانون (یعنی خدا اور رسولؐ کے قانون) کی حکومت ہونی چاہیے۔ کسی کو قانون سے بالاتر نہ ہونا چاہیے۔ کسی کو قانون کے حدود سے باہر جا کر کام کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے۔ ایک ایک عامی سے لے کر سربراہ مملکت تک سب کے لیے ایک قانون ہونا چاہیے اور سب پر اسے بے لاگ طریقے سے نافذ ہونا چاہیے۔ انصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ ہونا چاہیے اور عدالتوں کو انصاف کرنے کے لیے ہر دباؤ سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کی پیروی کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ بادشاہوں سے بڑھ کر اقتدار رکھنے کے باوجود وہ قانونِ الٰہی کی بندشوں میں جکڑے ہوئے

تھے۔ نہ ان کی دوستی اور رشتہ داری قانون کی حد سے نکل کر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکتی تھی، اور نہ ان کی ناراضگی کسی کو قانون کے خلاف کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ کوئی ان کے اپنے حق پر بھی دست درازی کرتا تو وہ ایک عام آدمی کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے، اور کسی کو ان کے خلاف شکایت ہوتی تو وہ استغاثہ کر کے انہیں عدالت میں کھینچ لا سکتا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنی حکومت کے گورنروں اور سپہ سالاروں کو بھی قانون کی گرفت میں کس رکھا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ عدالت کے کام میں کسی قاضی پر اثرانداز ہونے کا خیال بھی کرتا۔ کسی کا یہ مرتبہ نہ تھا کہ قانون کی حد سے قدم باہر نکال کر مواخذہ سے بچ جاتا۔ لیکن خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال واقع ہوتے ہی اس قاعدے کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ اب بادشاہ اور شاہزادے اور امراء اور حکام اور سپہ سالار ہی نہیں، شاہی محلات کے منہ چڑھے لونڈی غلام تک قانون سے بالاتر ہو گئے۔ لوگوں کی گردنیں اور پیٹھیں اور مال اور آبروئیں، سب ان کے لیے مباح ہو گئیں۔ انصاف کے دو معیار بن گئے۔ ایک کمزور کے لیے اور دوسرا طاقت ور کے لیے۔ مقدمات میں عدالتوں پر دباؤ ڈالے جانے لگے اور بے لاگ انصاف کرنے والے قاضیوں کی شامت آنے لگی۔ حتیٰ کہ خدا ترس فقہاء نے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کوڑے کھانا اور قید ہو جانا زیادہ قابلِ ترجیح سمجھا تاکہ وہ ظلم و جور کے آلۂ کار بن کر خدا کے عذاب کے مستحق نہ بنیں۔

۷۔ حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات

مسلمانوں میں حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات، اسلامی دستور کا ساتواں اصول تھا جسے ابتدائی اسلامی ریاست میں پوری قوت کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان نسل، وطن، زبان وغیرہ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ قبیلے اور خاندان اور حسب ونسب کے لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ تھی۔ خدا اور رسولؐ کے ماننے والے سب لوگوں کے حقوق یکساں تھے اور سب کی حیثیت برابر تھی۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح اگر تھی تو سیرت و اخلاق اور اہلیت وصلاحیت، اور خدمات کے لحاظ سے تھی۔ لیکن خلافت کی جگہ جب بادشاہی نظام آیا تو عصبیت کے شیاطین ہر گوشے سے سر اٹھانے لگے۔ شاہی خاندان اور ان کے حامی خانوادوں کا مرتبہ سب سے بلند و برتر ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر ترجیحی حقوق حاصل ہوئے۔ عربی اور عجمی کے تعصبات جاگ اٹھے۔ اور خود عربوں میں قبیلے اور قبیلے کے درمیان کش مکش پیدا ہو گئی۔ ملتِ اسلامیہ کو اس چیز نے جو نقصان پہنچایا اس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

امام حسینؓ کا مومنانہ کردار

یہ تھے وہ تغیرات جو اسلامی خلافت کو خاندانی بادشاہت میں تبدیل کرنے سے رونما ہوئے۔ کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ یزید کی ولی عہدی ان تغیرات کا نقطہ آغاز تھی' اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اس نقطے سے چل کر تھوڑی مدت کے اندر ہی بادشاہی نظام میں وہ سب خرابیاں نمایاں ہو گئیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا تھا' اس وقت یہ خرابیاں اگرچہ بتمام وکمال سامنے نہ آئی تھیں مگر ہر صاحبِ بصیرت آدمی جان سکتا تھا کہ اس اقدام کے لازمی نتائج یہی کچھ ہیں اور اس سے ان اصلاحات پر پانی پھر جانے والا ہے جو اسلام نے سیاست و ریاست کے نظام میں کی ہیں۔ اسی لیے امام حسینؓ اس پر صبر نہ کر سکے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو بدتر سے بدتر نتائج بھی انہیں ایک مضبوط جمی جمائی حکومت کے خلاف اٹھنے میں بھگتنے پڑیں' ان کا خطرہ مول لے کر بھی انہیں اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کوشش کا جو انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ مگر امامؓ نے اس عظیم خطرے میں کود کر اور مردانہ وار اس کے نتائج کو انگیز کر کے جو بات ثابت کی وہ یہ تھی کہ اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات امتِ مسلمہ کا وہ بیش قیمت سرمایہ ہیں جسے بچانے کے لیے ایک مومن اپنا سر بھی دے دے اور اپنے بال بچوں کو بھی کٹوا بیٹھے تو اس مقصد کے مقابلے میں یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے اور ان خصوصیات کے مقابلے میں وہ دوسرے تغیرات جنہیں اوپر نمبروار گنایا گیا ہے' دین اور ملت کے لیے وہ آفتِ عظمیٰ ہیں جسے روکنے کے لیے ایک مومن کو اگر اپنا سب کچھ قربان کر دینا پڑے تو اس میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔ کسی کا جی چاہے تو اسے حقارت کے ساتھ ایک سیاسی کام کہہ لے مگر حسینؓ ابن علیؓ کی نگاہ میں تو یہ سراسر ایک دینی کام تھا' اسی لیے انہوں نے اس کام میں جان دینے کو شہادت سمجھ کر جان دی۔

(یہ تقریر لاہور میں شیعہ سنی حضرات کی ایک مشترکہ نشست میں کی گئی تھی' جو ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کی اشاعت ماہ جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی)۔

بقیہ: قرآن کا نظریہ کائنات

گہوارہ ہیں۔ بالفاظ دیگر آسمان میں یہ جو بے شمار تارے اور سیارے نظر آتے ہیں یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زمین کی طرح ان میں بھی بکثرت ایسے ہیں جن میں دنیائیں آباد ہیں۔"

(جاری ہے)

قرآن کا نظریۂ کائنات

ڈاکٹر عبدالمغنی

(قسط ۱)

فطرت و قدرت

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ

(الملک ۶۷ : ۳)

(تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے' پھر پلٹ کر دیکھو' کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے ؟)

فطرت و قدرت کے الفاظ عام طور پر ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان لغت کے اعتبار سے ایک فرق ہے۔ فطرت دنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کی اصلیت ہے اور اس لحاظ سے ہستی کے جتنے مظاہر ہیں سب کا تعلق فطرت سے ہے۔ آدمی کے نقطۂ نظر سے ایک فطرت اس کے وجود کے اندر ہے' دوسری فطرت اس کی نگاہوں کے سامنے زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی پوری کائنات ہے۔ قدرت درحقیقت خدا کی قدرت؛ اس کی قوت و طاقت اور اس کے بنائے ہوئے اس منصوبہ و نظام کا نام ہے جو زندگی کے تمام جلوؤں اور پہلوؤں پر حاوی ہے۔ چنانچہ اگر محاورے میں فطرت کو بھی قدرت کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں وجود کے تمام مظاہر کو ایک خدا کی مخلوقات سمجھا جاتا ہے۔

فطرت و قدرت کی یہ ہم آہنگی بلاوجہ نہیں۔ یہ انسان کے ضمیر کی آواز بھی ہے اور زندگی کا قانون بھی۔ ہزاروں' لاکھوں سال سے جو کارخانۂ ہستی چل رہا ہے وہ بے بنیاد اور بے معنی نہیں۔ اس کا ایک مقصد ہے۔ آدمی کی عقل نے جس حد تک بھی اس مقصد کو سمجھا ہے اسے محسوس ہوا ہے کہ کائنات کی تخلیق کسی بالاتر ہستی کے ارادے سے' اس کے منصوبے کے مطابق ہوئی ہے اور حیات ایک نعمت ہے جو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کے تقاضے پورے کیے اور اس کی

ذمے داریاں ادا کی جائیں۔ یہ احساس خدا کی مشیت اور اس کی بنائی ہوئی تقدیر کی طرف بہت واضح اشارہ کرتا ہے، جس سے زندگی کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ اہمیت انسان سے زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ رویے کا مطالبہ کرتی ہے۔ دنیا کھیل تماشے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں زندگی کی جو نوعیت ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کچھ کر دکھانے کی جگہ ہے اور جو کچھ کیا جائے گا اس کا ایک اندازہ بھی لگایا جائے گا، جس کے مطابق کرنے والے کی حیثیت کا تعین ہوگا۔ ایسی حالت میں آدمی کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ فطرت و قدرت کی حقیقتوں، اصولوں اور مطالبوں کو سمجھ کر ان کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہستی نہ صرف باقی رہے بلکہ اسے صحیح طور پر ترقی کا موقع ملے۔

حیات و کائنات

فطرت و قدرت کی طرح حیات و کائنات کے الفاظ بھی بہ کثرت ساتھ ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں، گرچہ ان کے معنوں میں جو فرق ہے وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ہے، کہ حیات و کائنات کے درمیان ایک اندرونی ربط ہے۔ حیات بغیر کائنات کے نہیں ہوسکتی، وہ کائنات کے اندر ہی ہوتی ہے اور اس کے تقاضے ایک کائنات بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کا کوئی تصور حیات کے بغیر معمول کے مطابق نہیں کیا جاسکتا، کائنات جب ہے تو اس میں حیات بھی ہے۔ رہا یہ سوال کہ کائنات پہلے ہے یا حیات، تو اس کا جواب آسان نہیں اور یہ مرغی پہلے کہ انڈا پہلے جیسا سوال ہوجاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حیات و کائنات کا وجود ساتھ ساتھ ہوا۔

بہرحال، زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ حیات و کائنات کا وجود یک بارگی ہوا یا کسی ارتقا کے نتیجے میں؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے اگر یہ مان لیا جائے کہ حیات و کائنات میں ترقی کا ایک سلسلہ ہے تب بھی پہلا اور بنیادی سوال یہ ہوگا کہ کائنات یا حیات کا وہ مادہ کیسے وجود میں آیا جس نے ترقی کے مدارج طے کیے؟ یہ سوال بھی ساتھ ساتھ اٹھے گا کہ کیا تمام چیزیں ایک دوسرے کے اندر سے نکلتی چلی گئی ہیں؟ ان سوالوں کے قطعی جواب دینے سے انسان کی عقل قاصر ہے، اس لیے کہ اس کے پاس کوئی ٹھوس اور واضح ثبوت اس بات کا نہیں کہ وجود کا بنیادی مادہ کب اور کیسے پیدا ہوا، پھر مختلف چیزیں کس طرح ابھرتی اور بڑھتی چلی گئیں؟

اب کائنات اور اس میں حیات کی جو شکل ہمارے سامنے ہے اور ہم نے دونوں کی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اس کے سوا کوئی اقرار نہیں کرسکتے کہ

حیات و کائنات کے متعلق ہمیں پوری سنجیدگی سے ایک رائے قائم اور ایک رویہ اختیار کرنا چاہیے، تاکہ ہم سایوں اور سرابوں کے پیچھے نہیں دوڑتے رہیں اور دھوکا نہیں کھائیں، زندگی کو برباد نہیں کریں، بلکہ حقیقتوں کو سمجھ کر، شعور کی روشنی میں اپنی قوت اور وقت کا استعمال زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے کریں، تاکہ ایک منزل کی طرف آگے بڑھیں، کامیابی اور ترقی کا راز اسی میں ہے۔

بنیادی رویّہ

فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کے متعلق بنیادی طور پر انسان کے لیے ضروری ہے کہ ایک واضح رویّہ اختیار کرلے، ورنہ دنیا میں اس کی زندگی بالکل غیرفطری، نامعقول اور بے کار ہوگی۔ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہ ہو کر جو حیات اسے ملی ہے وہ کیا ہے، جس کائنات میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی کوئی حقیقت ہے اور جس فطرت پر اسے پیدا کیا گیا ہے یا وہ پیدا ہوا ہے اور جو فطرت اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے اس کے پیچھے کون سی قدرت کام کررہی ہے، تو ظاہر ہے کہ آنکھوں کے باوجود اس شخص کی زندگی ایک اندھے کی ہوگی، ایک ایسے اندھے کی جس کے سر اور دل دونوں کی آنکھیں بند ہوں گی، جس کا نہ کوئی ذہن و دماغ ہوگا نہ شعور و کردار، وہ حیوان سے بھی بدتر ہوگا اور اس کا شمار نباتات و جمادات میں کیا جائے گا۔

یہ بنیادی رویّہ دو قسم کا ہوسکتا ہے، ایک یقینی، ایک غیر یقینی۔ تمام مشاہدات و تجربات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کی اصلیت و حقیقت کا معاملہ غیب کا ہے اور صورت یہ ہے کہ اس کے متعلق یا تو کسی یقینی ذریعے سے کوئی واضح علم حاصل ہوجائے یا بالکل غیریقینی طور پر صرف قیاس و تخمین سے کام لیا جائے۔ دونوں صورتوں میں کچھ دلیلیں ہوں گی، لیکن جو دلیل شک اور گمان کی بنا پر دی جائے گی ظاہر ہے کہ اس سے زندگی کا کوئی ٹھوس عمل پیدا نہیں ہوگا، جب کہ یقین و اعتماد پر مبنی دلیل لازماً ایک ٹھوس عمل کی تحریک کرے گی۔ اس طرح زندگی کے متعلق دو مختلف بلکہ متضاد رویے رونما ہوں گے اور ان کے مخصوص نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

اس سلسلے میں رویوں کی سب سے واضح تقسیم یہ ہے کہ ایک رویہ مذہب کا ہے جس کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر ہے اور دوسرا رویہ لامذہبیت کا ہے جو آدمی کے عقلی قیاسات پر مبنی ہے۔ وحی کا صاف اقرار ایمان کی شان ہے اور وحی سے انکار یا اس کے متعلق تذبذب بے دینی کی کیفیت ہے۔ فطرت و قدرت اور حیات و کائنات کی معروف عالمانہ و حکیمانہ تحقیق دونوں حالتوں میں ممکن ہے

مگر ان کے نتائج اور اثرات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں گے۔ وحی پر ایمان کے ساتھ انفس و آفاق کا جو مشاہدہ و مطالعہ ہوگا وہ ایک مثبت ضابطۂ عمل مرتب کرے گا' جبکہ اس ایمان کے بغیر زندگی کے مظاہر کا جو تجسس کیا جائے گا اس میں منفی قسم کی فکری تشکیک پائی جائے گی۔

پرانے زمانے میں ان رویوں کی باہمی آویزش کو مذہب اور سائنس کی کش مکش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعبیر صحیح نہیں تھی۔ سائنس کے لیے لامذہب ہونا ضروری نہیں اور مذہب کے لیے لازمی نہیں کہ وہ سائنس کی مخالفت کرے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک سائنس مذہب پسند ہو اور دوسری مذہب بے زار' یہ فرق بھی دراصل سائنس دان کے ذاتی رویے پر منحصر ہے' ورنہ سائنس بجائے خود ایک غیر جانب دار شے ہے۔جس کا استعمال کسی بھی مقصد کیلئے ہوسکتا ہے۔

سائنس کا نظریۂ کائنات

کائنات سے عالموں اور فلسفیوں کی دلچسپی بہت پرانی ہے۔ بعض اہلِ علم کے درمیان ستارہ شناسی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ Astrology ایک پرانا فن ہے' جس میں دنیا اور آدمی کے حالات و واقعات پر ستاروں کی چال کا اثر دکھایا جاتا ہے۔ اس جنتر منتر نے بڑھ کر باضابطہ علمِ نجوم (Astronomy) کی شکل اختیار کرلی اور اس کی مزید ترقی طبیعیاتِ نجوم (Astrophysics) کی تشکیل کا باعث ہوئی' یہاں تک کہ کائنات' اس کے سیاروں اور ستاروں کے مطالعے کے لیے سائنس کے ایک تازہ ترین شعبے علمِ کائنات (Cosmology) کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن کائنات کے سارے حکیمانہ مشاہدات کی حد اس موضوع پر پیرس سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب کے اس ذیلی عنوان سے معلوم ہوجاتی ہے:

Conversations about The Invisible (غیب کے متعلق گفت و گو)[۱]

ظاہر ہے کہ غیب کے متعلق' جس کی کھلی اور قطعی شہادت کسی ٹھوس شکل میں نہیں مل سکتی' انسان کی ہر گفتگو ظن و تخمین اور قیاس و گمان پر مبنی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق کی مادی تعبیر کے متعلق سائنس کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتی اور اس سلسلے میں اس کا کوئی دعویٰ کسی واضح دلیل پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت تک سائنس دانوں کے درمیان یہ مباحثہ ہوتا رہا کہ کائنات ایک بار بن کر ساکن ہوگئی یا مسلسل حرکت و ترقی کررہی ہے۔ ۱۹۲۲ء سے ایک روسی سائنس دان' فریڈمین (Friedman) کائنات کے متحرک ہونے کا خیال پیش کرتا رہا' مگر ۱۹۵۰ء کی دہائی تک کائنات کی عمر کبھی دس بلین اور کبھی بیس بلین

(۱) اس گفتگو میں شریک ہونے والوں کے نام یہ ہیں:
Jean Audouze' Michel Casse 'Jean – Clawde Carriere

بتانے والے سائنس دان کائنات کی حرکت یا سکون کے متعلق اپنے اختلافات کا اظہار کرتے رہے۔ متحرک یا ساکن ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے محدود یا لا محدود ہونے کی منطقی بحث بھی چلتی رہی۔

ایچ بانڈی (H.Bondy)' ٹی گولڈ (T.Gold)' فرڈ ہوایل (Fred Hoyle)' ولیم فاؤلر (William Fowler) جیسے اہلِ علم و حکمت کائنات کی تعمیر و تشکیل پر مباحثے کرتے رہے' مگر وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ ان کی ایک بڑی الجھن اس سلسلے میں خدا کے اقرار و انکار کا مسئلہ تھا۔ سائنس دانوں نے علم کی غیر جانبداری میں اتنی انتہا پسندی کی کہ انہوں نے سائنس کو بے خدا (Atheist) تسلیم کرنا ضروری سمجھا اور اس مفروضے پر' جس کا حکیمانہ معروضیت (Scientific Objectivity) سے کوئی اصولی تعلق نہیں تھا' کائنات کے یک بارگی وجود کے بعد اس کو جامد قرار دے دیا' اس لیے کہ کائنات کی مسلسل حرکت کسی محرک کی ہستی کا تصور کرنے پر مجبور کرتی۔ یہ ایک عجیب و غریب صورتحال ہے اور بالکل محال و متضاد قسم کی ہے' ایک طرف ارتقا (Evolution) کا خیال ہے جو حرکت پر مبنی ہے اور دوسری طرف اس جمود کی وکالت ہے جو تخلیق (Creation) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس الجھن سے محسوس ہوتا ہے کہ لادین سائنس دان نہ تو ارتقا کا مطلب ٹھیک سمجھتے ہیں نہ تخلیق کا اور ان کی جانب سے معروضیت کے سارے دعوے دراصل ایک موضوعی (Subjective) مفروضے پر قائم ہیں۔ یہ طرزِ فکر کوئی فلسفہ ہو تو ہو' سائنس نہیں ہے۔ حکمت کے لیے انکارِ خدا کیوں ضروری ہو؟ سب سے بڑا حکیم اور حکمت بخش تو خدا ہی ہے!

۱۹۶۵ء میں ضربِ عظیم یا بڑی چوٹ (Big Bang) کا وہ نظریہ سامنے آیا جس کا غلغلہ آج تک بلند ہے۔ اس کے علمبردار لیمائیٹر (Lemaitre) اور گامو (Gamow) ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کائنات کا وجود ایک بیضۂ اصلی (Original Egg) سے ہوا جس میں جوہرِ قدیم (Primordial Atom) بہت ہی بڑی مقدار میں بھرا ہوا تھا۔ اس پہلے انڈے کے اندر انتہائی کثافت (Density) کے ساتھ ساتھ حدت (Heat) بھی تھی۔ یہ بنیادی مادہ "ابتدا" اپنے زبردست حجم میں تابانی و تابکاری سے معمور تھا۔ اب دو اہم ترین سوالات اٹھتے ہیں:

۱- بیضۂ اصلی کے عناصر کی ترکیب کیسے عمل میں آئی؟

۲- اس ترکیب کو وجود کے اگلے مرحلے پر کون حرکت میں لایا؟

سائنس کے تمام مکاتبِ فکر انہی سوالوں کے جواب کی جستجو میں سرگرداں ہیں' اس لیے کہ

کائنات کی ہستی اور ترقی دونوں کا راز اسی جواب میں پوشیدہ ہے اور حیات کے اسرار و رموز بھی اس میں مضمر ہیں۔ یہ جواب وہ شاہ کلید (Master Key) ہے جس سے زندگی کے بنیادی حقائق پر لگے ہوئے سب تالے کھل جاتے ہیں اور آفاق کی صداقتوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں کی مشکل یہ ہے کہ سوالات کا تعلق درحقیقت غیب (Invisible) سے ہے اور جواب ایمان (Faith) کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ غیب اور ایمان دونوں طبعی (Physical) نہیں، مابعد طبعی (Metaphysical) امور ہیں اور علم کائنات کا آغاز بھی مابعد طبعی ہے، انجام بھی مابعد طبعی، لہٰذا سوالوں کے جواب سائنس سے نہیں، مذہب، سے میسر آسکتے ہیں۔

قرآن کا نظریۂ کائنات

قرآن نے پہلے پارے کی پہلی ہی سورہ کی بالکل ابتدائی آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ کی کتاب، جو ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل کی گئی، ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ چنانچہ کائنات و حیات کے آغاز کے متعلق، جو سراسر غیب کا معاملہ ہے، قرآن حکیم کی حسب ذیل آیت ایک واضح اعلان کرتی ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (الانبیاء ۲۱ : ۳۰)

(کیا وہ لوگ جنھوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے؟)

اس کے فوراً بعد کی آیتوں میں تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے:

۱ - زمین میں پہاڑ جما دیے، تاکہ وہ ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں۔

۲ - آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔

۳ - رات اور دن بنائے۔

۴ - سورج اور چاند کو پیدا کیا۔

۵ - سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔ (الانبیا ۲۱ : ۳۱ - ۳۳)

آخری نکتے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری نوٹ یہ ہے:

"فلک' جو فارسی کے چرخ اور گردوں کا ٹھیک ہم معنی ہے' عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ "سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں" سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سب تارے ایک ہی "فلک" میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرا یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔(ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی از سید ابوالاعلیٰ مودودی" ۱۹۷۸ء' اشاعتِ اسلام ٹرسٹ' دہلی)

مذکورہ بالا سورہ الانبیاء کی آیت نمبر ۳۰ کیا کائنات کی تخلیق کے متعلق سائنس کے جدید ترین نظریے Big Bang کی طرف کھلا اشارہ نہیں کرتی ؟ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا" اس بیضۂ اصلی پر ایک ضربِ عظیم کا بیان ہے جس کی بات سائنس کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ صریحاً" زمین و آسمان کی مرکب شکل کے ٹوٹنے کا تذکرہ کرتے ہیں' یعنی ابتدائے کائنات میں جب وجود کے عناصرِ ترکیبی ایک دوسرے میں خلط ملط تھے ایک زور دار دھماکہ (Explosion) خدا کے حکم سے' اس کی مشیت کے مطابق ہوا' جس کے بعد ہستی کا ارتقا اگلے مراحل میں داخل ہوا۔ دھماکے سے پہلے بھی جو عناصر پیدا ہو کر ایک مرکب شکل میں یک جا ہوئے وہ خدا کی قدرت ہی کا کرشمہ تھا۔ وہی تمام چیزوں کا خالق ہے۔ عناصرِ وجود کی تخلیق' تحلیل اور ترکیب سب کچھ اس کی قدرت و مشیت کے تحت ہی ہوا ہے' ہو رہا ہے اور ہو گا۔

اس سلسلے میں زیرِ بحث آیت کا یہ جملہ کہ "پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی" کائنات اور اس میں حیات کی تخلیق و ترقی کے متعلق سائنس کی ایک اہم تصوّر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس نے جو نظریہ مشاہدے اور تجربے کے بعد قائم کیا اس کی طرف اللہ کی کتاب وحی کے ذریعے واضح اشارہ کرتی ہے۔ قرآن مجید کا فکر انگیز جملہ بالکل عام اور جامع ہے تمام زندہ چیزوں کے لیے' جب کہ زندگی کا اطلاق انسان اور حیوان کے علاوہ نباتات اور جمادات پر بھی ہو سکتا ہے۔ پودے جس طرح اگتے بڑھتے اور پہاڑ بنتے پھیلتے ہیں وہ زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس لیے ہر مخلوق' زندگی کے کسی بھی دائرے میں' پانی کے مادہ حیات ہونے کی شہادت دیتی ہے' پھر پانی کو بنیادی مادہ مان کر مختلف سطحوں پر مختلف قسم کی مخلوقات کے ارتقا کا امکان بھی ہے۔ بہر حال' جو

چیز بھی پیدا ہوئی یا ہوتی ہے اس کا خالق خدا ہے اور پانی کو بھی اس نے پیدا کر کے دیگر اشیاء و مخلوقات کی تخلیق کے لیے مادے کے طور پر استعمال کیا۔

زیر بحث آیت سے متصل آیات میں زمین، پہاڑ، آسمان، رات، دن، سورج اور چاند کی تخلیق کا تذکرہ کر کے قرآن حکیم نے کائنات کے متعدد اہم ترین مظاہر کا احاطہ کر لیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد وجود کی توسیع و ترقی اور ہستی میں اضافہ و ارتقا خدا کی قدرت و مشیت کے تحت، اس کی بنائی ہوئی تقدیر کے مطابق ہوا اور یہ جملہ کہ "سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک خدائی منصوبے کے تحت، ایک خاص ترکیب و ترتیب سے ہو رہا ہے۔ سائنس اس جملے سے سیاروں اور ستاروں کا مفہوم اخذ کر سکتی ہے، جب کہ کلامِ الٰہی نے ایک جامع اصول اور ایک عام قاعدے کی وضاحت کر دی ہے۔

یہ وہ نکات ہیں جو قرآن میں مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے بار بار پیش کیے گئے ہیں۔ نمونے کی چند آیتیں حسب ذیل ہیں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ○ (البقرہ ۲ - ۱۶۴)

(جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں)۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (ہود ۱۱ : ۷)

(اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے

اس کا عرش پانی پر تھا ۔۔۔ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔)

تفسیری نوٹ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ :

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے' یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجود صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی؟ عرش پر ہونے کا مفہوم بھی متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہو کہ اس وقت خدا کی سلطنت پانی پر تھی۔"

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر ۵۴ : ۴۹)

(ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے)۔

اس آیت کی تشریح مولانا مودودیؒ نے اس طرح کی ہے :

"یعنی دنیا کی کوئی چیز بھی الل ٹپ نہیں پیدا کردی گئی ہے' بلکہ ہر چیز کی ایک تقدیر ہے جس کے مطابق وہ ایک مقرر وقت پر بنتی ہے۔ ایک خاص شکل اختیار کرتی ہے' ایک خاص حد تک نشوونما پاتی ہے' ایک خاص مدت تک باقی رہتی ہے اور ایک خاص وقت پر ختم ہوجاتی ہے۔"

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (الطلاق ۶۵ : ۱۲)

(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جارہی ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے)۔

آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں :

"انہی کے مانند" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں' بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور "زمین کی قسم سے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین جس پر انسان رہتے ہیں اپنی موجودات کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی بنا رکھی ہیں جو اپنی اپنی آبادیوں کے لیے فرش اور

بقیہ بر صفحہ ۳۶

رسائل و مسائل

قضا و قدر

قرآن کریم کی آیتِ کریمہ "بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ" کے مطالعہ سے درج ذیل اشکال ذہن میں ابھر رہے ہیں۔

آیت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی قرآن لوحِ محفوظ میں مکتوب شکل میں موجود تھا' جسے بعد میں تھوڑا تھوڑا کرتے ہوئے نازل کیا گیا۔ یعنی نبی اکرمؐ کی نبوت کے دوران گزرنے والے واقعات و حادثات' غزوات' سرایات' طائف کا سفر' حضور کا پتھر کھانا' صلح حدیبیہ وغیرہ پہلے سے ان کا ہونا طے شدہ حالت میں مکتوبا موجود تھا۔ تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات سے کیونکر گزارا گیا۔ اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ سکرپٹ پہلے سے موجود تھا' جس پر بعد میں عمل کیا گیا۔

اس سے دوسرا پہلو بھی ذہن میں ابھرتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو شیطان بھی پھر بے قصور ہے کہ اسے پہلے سے طے شدہ امر کے تحت ان مراحل سے گزارا گیا۔ اور اس نے بھی سکرپٹ کے تحت اپنا کردار ادا کیا۔ پھر اس کا قصور تو نہ ہوا۔ مزید یہ کہ اگر یہ ساری ڈرامائی تشکیل ہے تو ایکٹر کو اپنے کردار کا پہلے سے علم ہوتا ہے' تو اس پورے قرآن کو ڈرامائی تشکیل دینا ایکٹرز کے علم میں تھا یا نہیں؟

آپ نے "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ" کے متعلق جس اشکال کا ذکر کیا ہے' وہ اشکال درحقیقت قضا و قدر کے بارہ میں ہے۔ تقدیرِ الٰہی کا معاملہ صرف قرآن کریم میں لکھی ہوئی باتوں تک محدود نہیں۔ کوئی پتہ بھی ایسا نہیں گرتا جس کا اسے علم نہ ہو' اور جو ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا نہ ہو (الانعام : ۵۹)۔ بلکہ معاملہ علم سے بھی آگے ہے۔ زمین و آسمان میں ایک پتہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ کوئی کام' نیکی یا گناہ' اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ پھر اطمینان کیسے ہو کہ انسان مجبور نہیں' اور اپنے اعمال کے لیے جزا و سزا کا سزا وار ہے؟

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ مسئلہ ذاتِ باری تعالیٰ' اور کائنات میں

اس کے خلق و امر اور تدبیر و تصرف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا کوئی ایسا جواب جو ہر شک اور ہر اعتراض کا ازالہ کر دے ممکن نہیں۔ ورنہ پھر ایمان بالغیب کے مطالبہ' اور امتحان' اور اس پر حساب اور جزا و سزا کا کوئی جواز نہ رہتا۔ اگر شک و اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے تو انسان ماننے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ ایمان میں جبر نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے اختیار کی بات ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسان مخلوق کے ذہن سے' اور مخلوق کی زبان میں سوچتا اور اظہارِ مدعا کرتا ہے۔ خالق کے بارہ میں مخلوق کی فہم' تصورات اور زبان پوری حقیقت سمجھنے اور بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ اس لیے کہ خالق تو ایک ہی ہے (اَحَد)' اور باقی ہر چیز مخلوق۔ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں۔ انسان تو آج تک مادہ کی حقیقت کی تہہ بھی نہیں پا سکا ہے۔

اس لحاظ سے "پہلے" اور "بعد" کے الفاظ خالق کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ "اوّل" بھی ہے اور "آخر" بھی' "ظاہر" بھی ہے اور "باطن" بھی۔

تیسری بات یہ کہ اوّل آپ اس مسئلہ پر خالق کے پہلو سے غور کریں۔ اس کے علم کو لیجیے۔ اس کا علم اوّل و آخر پر محیط ہے۔ اگر اسے یہ علم نہ ہو کہ کوئی مخلوق کل کیا کرے گی' تو وہ مخلوق' خالق کی طرح ہو جائے گی۔ خالق کا علم ناقص ہو گا۔ حالانکہ خالق کو احد اور کامل ہونا چاہیے۔ لیکن کیا اس کے اس علم سے کہ کل ایسا ہو گا' کسی کا مجبور ہو جانا' مسئول نہ ہونا' ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ نوکر کو بازار بھیجیں' کسی طرح آپ کو علمِ یقینی ہو جائے' بلکہ آپ مستقبل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں' کہ وہ سودے میں چوری کرے گا' اور آپ اس بات کو لکھ بھی دیں ---- تو کیا آپ کے علم اور لکھ دینے سے وہ اپنے چوری کے جرم کے لیے مجبور ہو جائے گا۔

اب اس کی قدرت اور مشیت کو لیجیے۔ اگر کائنات میں ایک پتہ بھی اس کی اجازت کے بغیر ہلنے کی طاقت رکھتا ہو' تو خدائی سے باہر وہ پتہ خود ایک خدا ہو گا۔ لیکن کائنات میں دو خدا نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور ماشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ کہا گیا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اب مخلوق کے پہلو سے غور کریں۔ عملاً آپ کون سا کام کرنے کے لیے' کس نیکی کو کرنے کے لیے' کس برائی میں ملوث ہونے کے لیے' اپنے کو مجبور پاتے ہیں؟ آپ جو کام کرتے ہیں اپنے ارادہ سے کرتے ہیں۔ پھر نظری موشگافیوں میں الجھ کہ آپ انسان کو مجبور' بے قصور اور ایکٹر کیوں قرار دیں۔ انسان کا اپنے اعمال کے لیے مسئول ہونا تو اتنا صاف اور ظاہر ہے کہ آپ ایک کتے کو لکڑی سے ماریں' تو وہ بھی لکڑی کو کاٹنے نہیں دوڑے گا' آپ پر لپکے گا۔

ایک پہلو اور ہے۔ اگر انسان واقعی "کلیتاً" مجبور ہی ہے' تو اسے اپنے بے قصور ہونے کا

دعویٰ کرنے' اپنے مجبور ہونے کا گلہ کرنے 'اور اپنی سزا پر اعتراض کرنے کا اختیار کہاں سے مل گیا؟

پانچویں بات یہ کہ انسان کو مجبوری کی تہمت سے بچانے اور با اختیار کرنے کے لیے اگر یہ ضروری ہو کہ اس کے اعمال کا علم اللہ کو نہ ہو' یا وہ اس کی مشیت و اجازت کے بغیر کوئی کام کر سکے' تو مجبوری کی یہ تہمت خود اللہ پر لگ جائے گی۔ ایسے ناقص خدا کو انسان کیسے اپنا دل دے گا' اپنا معبود بنائے گا' اس کے آگے ہاتھ پھیلائے گا' جس کی خدائی میں اس کی اجازت کے بغیر جس کا جو دل چاہے کرتا پھرے' اور اسے یہ پتہ ہی نہ ہو کہ کل کیا ہو گا۔

آخری بات یہ کہ' اس کے بعد بھی اگر آپ کو کوئی تضاد نظر آئے یا عقدہ لاینحل رہ جائے تو کھوج کرید سے رک کر آمنت باللہ کہیں۔ ورنہ بات وہیں پہنچے گی کہ پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ اسی لیے قضا و قدر کے بارہ میں بحث و مباحثہ ناپسند کیا گیا ہے۔

آپ غور کریں گے تو تشفی کے لیے یہ نکات انشاء اللہ کافی ہوں گے۔ باقی رموزِ غیب کی پوری کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ (خ۔ م)

جماعت اور افراد کے اعمال

بحوالہ جسارت فرائیڈے سپیشل ' آپ کے اس خیال سے میں بہت سوچ کے بعد بھی اتفاق نہ کرسکا کہ جماعتوں کو اپنے افراد کے کردار کے لیے جواب دہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس منطق کے مطابق پولیس والے خود جرائم میں ملوث ہوں تو محکمہ اور دوسرے ذمہ دار افراد بری الذمہ ہوں گے ؟ جماعت اسلامی' مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی میں کچھ فرق قائم رہ سکے گا ؟ آپ آج کل جماعت کے ذہنی قائدین میں سے ہیں لیکن' اگر قیادت کی فکر یہی ہے تو ۔

کارطفلاں تمام خواہد شد !

شاید انٹرویو میں میری بات آپ پر پوری طرح واضح نہ ہوسکی۔ ورنہ یہ بات تو دین کے معروف بنیادی اصول پر مبنی ہے۔

میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ جماعتِ اسلامی' اپنے اندر اور باہر' دعوت الی الخیر' امربالمعروف اور نہی عن المنکر اور تعلیم و تزکیہ کی ذمہ دار نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ وہ اپنے سے وابستہ افراد کے اعمال کے لیے مسئول ' قابلِ ملامت اور موردِ الزام نہیں' الاّ یہ کہ یہ اس کی اجازت سے ہوں اور وہ ان پر مناسب کارروائی نہ کرے۔

معاشرہ' ریاست' ادارہ' جماعت یا فرد اس بات کے لیے تو ذمہ دار ہے کہ وہ اپنی بساط بھر نیکی

کی دعوت دے، نیکی پر چلانے کی کوشش کرے، تعلیم و تزکیہ کا کام کرے، اور جہاں اختیار ہو وہ اجتماعی طور پر نیکیاں نافذ کرے۔ اس کے تحت کوئی فرد غلطی کرے، تو جہاں شرعی تقاضا ہو وہاں سزا دے (اگر اس کا حکم چلتا ہو)، ورنہ اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصولوں اور حکمت کے مطابق تادیب کرے، تنبیہہ کرے، یا معاف کردے۔

لیکن ہر فرد اپنے نیک و بد اعمال کے لیے خود ہی ذمہ دار ہے، اور خود ہی مسئول اور قابل ملامت، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ دین کا اتنا معروف و مسلّمہ اصول ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ، لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ، فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا، وغیرہ وغیرہ۔

جب کوئی فرد گناہ کرتا ہے، تو دوسرا فرد یا جماعت اس کے لیے اسی حد تک ذمہ دار ہے جس حد تک وہ اس گناہ کا باعث ہے، یا اس میں شریک۔ اور دوسرے کی اس ذمہ داری سے اس کی اپنی جوابدہی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

کیوں کہ ہر شخص امتحان گاہ میں ہے اور اپنے عمل کے لیے مختار، اس لیے کوئی نظامِ تربیت، کوئی نظامِ تعزیر، کوئی نظامِ جماعت، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مزکّی، یہاں تک کہ خود نبی و رسول بھی، اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ ان کے ساتھ، یا ان میں شامل، کوئی فرد گناہ نہیں کرے گا۔ نہ وہ، اس کے گناہ کرنے کی صورت میں، اس کے لیے موردِ الزام اور جواب دہ ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

انبیا اور رسل پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان سے بڑھ کر مزکّی کون تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام اپنے بیٹے اور بیوی کے لیے، حضرت لوطؑ اپنی بیوی کے لیے، ذمہ دار اور مورد الزام نہیں ٹھہرائے گئے۔ مدینہ کے اوّلین معاشرہ میں، یا یوں کہیے کہ اس وقت کی جماعتِ اسلامی کے ارکان میں، لوگوں سے زنا کا جرم بھی سرزد ہوا، چوری کا بھی ہوا، میدانِ جنگ سے پلٹ آنے کا بھی ہوا، افک کا بھی ہوا ــــ لیکن ان میں سے کسی کے لیے حضورؐ یا آپؐ کی جماعت اور معاشرہ کو ملامت نہیں کی گئی۔ آپؐ کی طرف سے یہ کافی تھا کہ آپؐ نے گناہ کو گناہ بتایا، ان سے روکا، سرزد ہوئے تو مناسب کارروائی کی۔ آپ بلاغ اور شہادت کے لیے ذمہ دار تھے۔ عرفات میں اسی کی گواہی پر آپؐ نے بات ختم کردی۔

سوچیے، اگر آج جماعتِ اسلامی کے کسی رکن سے خدانخواستہ زنا کا گناہ سرزد ہوجائے تو کیا طوفان نہ مچے گا۔ (اور انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا امکان تو ہر وقت موجود ہے)۔ "جماعت

بقیہ بر صفحہ ۲۵

مطبوعات

سہ ماہی ادبیات : مجلہ اکادمی ادبیات پاکستان، شمارہ ۲۲ ج ۶ - ۱۹۹۳ء۔ مدیر مسئول : جناب غلام ربانی آگرو، مدیر اعلیٰ : خالد اقبال یاسر، مدیر منتظم : جناب افتخار عارف۔ مقام اشاعت : سیکٹر ۱/۸ - ایچ، اسلام آباد، ۴۴۰۰۰۔ صفحات : ۳۳۲ قیمت فی شمارہ ۴۰ روپے۔ سالانہ ۱۶۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ۔

اول تو میں رسالے کی ظاہری خوبیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا (پہلے بھی ہمیشہ خوش ہوتا ہوں)۔ٹائٹل سو اول درجے کا دبیز آرٹ پیپر، بھر رنگینیوں سے بھرپور، نقوش ایسے کہ عام نظر سے دیکھو تو معما، اور کچھ دیر سکون سے دیکھو تو ان لا۔معنیات میں سے وہ تصویری ساختیات رونما ہوتی ہیں کہ زوار حسین کے موقلم کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اسی دنیا کا ہے، یا بیرونی ما[illegible] سے کسی سے بھیجا گیا۔ کیونکہ آرٹ کے ہیولا کی مجموعی ساخت اوپر کو اٹھتی ہے اور دیکھنے [illegible] کے ذہن کو بھی اٹھاتی ہے۔ ورنہ اتنے ڈیزائن دیکھے ہیں کہ جی اوب گیا، خصوصاً جو آرٹسٹ سیکس کی مکھی پر سیکس کی مکھی مارتا رہے،بلکہ کبھی تبدیلی ذائقہ نظر کے لیے بھینس بھی مار دے، تو ایسے اہل کمال کی چیزیں دیکھ دیکھ کر آرٹ سے منہ پھیر لیا کہ نسائیت کا گوشت قیمہ ہوتے ہوئے دیکھنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بے شکر کی سیاہ کافی پی لے۔ زہر کی کاٹ زہر ہی سے ہوتی ہے۔اتنا کچھ لکھنے کے بعد ظاہر ہے کہ "دغیرہ وغیرہ" ہی لکھنے کی گنجائش ہے۔ مگر خیر دس سطر لکھ دی جائیں تو زیادہ خطرہ نہیں۔

۱ سے ۱۲ صفحے تک حمد و نعت کا سلسلہ ہے۔ آج مجھے کتنی خوشی ہے کہ ادبی رسالوں میں سب سے پہلے میں نے (سیارہ میں) اس باب کا افتتاح کیا اور بہت سی جبینیں شکن آلود ہوئیں، بہت سی زبانوں نے ملائیت کے طعنے دیے مگر ہم نے بھی اپنا چلن جاری رکھا۔ یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ آج خدا کا کرم کوئی ادبی رسالہ (چاہے وہ کمیونسٹی مسلک کا ہو) حمد و نعت

کے صفحات سے خالی نہیں اور ادبیات کا تو حق ہے کہ وہ کتب و جرائد کی اس نہایت قدیم روایت کو (عربی میں' فارسی میں' اردو میں' ہماری علاقائی بولیوں میں) درخشاں کرے' اس نے حق ادا کردیا۔ تبرکاً" حمد کا ایک شعر۔

مری سوچوں کو اک میزان دے کر   مرے ہاتھوں سے مجھ کو تولتا ہے

اور ایک شعر نعت کا۔

اس کے اجمال کی تفصیل رقم کیا ہو گی   جو تصوّر بھی کیا ہم نے ادھورا نکلا

ادبیات نے ایک بڑا کام کیا ہے کہ ۲۴۰ صفحات میں پنجابی اور سرائیکی سے اردو میں ترجمہ کر کے ۵۱ مختصر کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان میں سے جتنی میں پڑھ سکا وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ یعنی ان مقامی زبانوں میں سوچنے اور لفظوں کو بل دینے والوں اور معنی نچوڑنے والوں نے خوبیٔ تفکر کو بھی پیش کیا' بیانیہ طرز کو بھی پلاٹ کے ساتھ اچھی گندھاوٹ دی۔ مگر یہی باتیں براہ راست بھی اردو میں لکھی جاسکتی تھیں' کیونکہ اب دلی' لکھنؤ سے آزاد شدہ اردو پنجاب کے دیہاتی کلچر کو اٹھا سکتی ہے۔ مجھے کوئی مخالفت منظور نہیں' بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں ادب کے ذریعے فکری وحدت کی طرف آنا چاہیے اور مقامی بولیوں میں جو کچھ کہنا ہو اس کے لیے اردو میں راستے بنانے چاہئیں۔

خصوصی باب سجاد حیدر (فن اور شخصیت) کے متعلق ہے اور ۵ مضامین میں بہت کچھ آچکا ہے۔ "فنون لطیفہ" پر خصوصی مقالہ زوار حسین کے فن کے متعلق علی تنہا نے لکھا ہے۔ ہم اس دریاؤ علم کے پیراک نہ سہی مگر سیربین سے "تک دیکھ لیا" کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ علی تنہا کے تین جملے میں درج کرتا ہوں:

"زوار حسین کی مصوّری ہمارے عہد کا چہرہ ہے" (خدا کرے کوئی چہرہ بچا رہ گیا ہو)۔

"مصوّری کے عمل سے زیادہ زوار حسین کی مساعی رہی ہے کہ مصوّری کے عمل کی مختلف ماہیتوں اور کیفیتوں کو دریافت کرے" اور

"زوار حسین کا دعویٰ ہے کہ اس نے فرانس کے نابغۂ دہر فن کاروں کے خیالات کو اردو میں ترجمہ کرتے وقت ذرا بھی دقت نہیں محسوس کی" (حسن عسکری سے اختلاف' ن' ص)۔

مصوّر کی دس تخلیقات سادہ یک رنگی رسالے میں دی گئی ہیں۔

"جائزہ" کے زیرعنوان گیارہ مطبوعات پر متعدد اصحاب کے لکھے تبصرے نکات انگیز ہیں۔

"جان پہچان" میں کچھ لکھنے والوں کے نام پتے اور بعض کی تصاویر ہیں۔
تبصرہ کیا ہوا' ہم نے صرف گنتی گن دی۔ کاش کہ مطالعہ کردہ کہانیوں پر تفصیلی رائے دے سکتا۔ (ن - ص)

سہ ماہی "فکر و نظر" سیرت نمبر: ظفر اسحاق انصاری صدر مجلس مدیراں۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد۔ صفحات ۴۳۱۔ کاغذ اچھا۔ قیمت ۷۵ روپے۔

اس نمبر میں جمع شدہ تحریروں میں سے کچھ کی جھلک دیکھی' بعض کو نادر پایا' بعض پہلے میرے مطالعہ سے گزر چکی ہیں۔ ان مضمونوں کا خلاصہ بیان کرنا یا ان پر اختلافی بحثیں اٹھانا اگرچہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی ہو سکتا ہے جبکہ مقصد خیر خواہی اور خدمتِ دین اور درخشانیٔ سیرتِ پاکؐ ہو۔ مگر نہ اس کی جگہ ہے اور نہ اصل مضامین پڑھے بغیر پہلے سے کچھ بحثیں قاری کے راستے میں بکھیر دینا کچھ اچھا ہے۔

البتہ مندرجات کی فہرست مع اسماء اہلِ قلم پیش کردینے سے پڑھنے والے کے سامنے ان دلچسپ مباحث و حقائق کا چمن آراستہ ہوجائے گا جن سے سیرت پاکؐ کی نگارش یا اس کے مطالعہ کا راستہ گزرتا ہے۔

ادھر کئی برس سے حبِ رسولؐ اور عقیدتِ رسولؐ کے جذبات بعض وجوہ سے ایسے شاداب ہوئے ہیں کہ ایک طرف نعتیہ شاعری کا ایک سمندر دس بارہ سال میں ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے' دوسری طرف سیرت پاکؐ پر بڑی اہم کتابیں اور خاص اشاعتیں نمودار ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہادیٔ برحقؐ کی سیرتِ مطہرہ پر چھوٹی بڑی کتابوں اور رسائل کے خاص نمبروں کی ایک متوسط سی لائبریری وجود میں آگئی ہے۔ ایسی مختصر سی لائبریری متوسط الحال شخص خود خرید سکتا ہے یا محلوں کے کلب یا سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر اور تعلیمی ادارے اس کا انتظام بآسانی کرسکتے ہیں۔

(۱) حیاتِ رسول بہ ترتیب زمانی از ڈاکٹر محمد میاں صدیقی۔ عنوان سے ظاہر ہے کہ ولادت سے وفات تک تقریباً ۶۷ اہم واقعات کی تاریخی ترتیب۔ ہجری اور عیسوی دونوں پر تاریخیں درج ہیں' بہت مفید ہے۔

(۲) "کلامِ رسولؐ کے ادبی محاسن"۔ اس جامع عنوان کے تحت "حدیثِ نبوی' ابلاغی اعجاز" از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر۔ "ادعیہ ماثورہ' ادبی محاسن" از ڈاکٹر محمد طفیل۔ "مکاتیبِ نبویؐ کا ادبی پہلو"۔

(۳) نذرانۂ عقیدت کے سلسلے میں "ہاؤسا زبان میں نعت گوئی" (یہ نیا تجربہ ہے) از ڈاکٹر محمد خالد مسعود "ذکر رسول ---- بلوچی و براہوی ادب کے آئینے میں۔" از ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ "پاکستان میں فنِ نعت" از راجہ رشید محمود۔ نوجوان کے قلم سے مبحث کا خاصا احاطہ کیا گیا ہے۔ ریسرچ ورک ہے۔ گفتگو حوالوں سے مزین ہے۔ "بارگاہِ رسالت میں" از ڈاکٹر رحیم بخش شاہین۔

(۴) اسوۂ حسنہ کے باب میں پہلا مضمون "اسلامی فلاحی ریاست (اسوہ حسنہ کی روشنی میں)" از ڈاکٹر شیر محمد زمان۔ یہاں میرا خیال ہے کہ ہمیں مغرب کی رائج کردہ اصطلاح فلاحی ریاست کے محدود تصور سے بالاتر ہوکر جامع اور وسیع تر خدمتی ریاست یا خادمِ خلق ریاست کی اصطلاحات کو اختیار کرنا چاہیے' کیونکہ مادی فلاح سے بالا تر فلاح کی ذمہ دار بھی ریاست ہے۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ مقالہ نگار نے اس حقیقت کو خود باحسنِ استدلال و بیان ص ۱۸۶ کی سطرے سے لے کر آخر صفحہ تک پیش کردیا ہے۔ میرا مقصود اسی فرق کی وجہ سے اصطلاح کو بدلنا ہے۔

"شمائلِ نبوی کا ایک ارتقائی جائزہ" از ڈاکٹر خالق داد ملک۔ "تعلیماتِ نبوی میں سائنسی محرکات" از پروفیسر امتیاز احمد سعید۔ "آنحضرت کا منہج تعلیم" از پروفیسر غزل کاشمیری۔ (کہنا پڑتا ہے کہ مولف نے پہلے سے اس موضوع پر اردو میں کام کرنے والوں کو نظرانداز کیا ہے اور وہ ان کی تحریریں جمع نہیں کرسکے۔ مثلاً پروفیسر سید محمد سلیم کا کام۔ ایک مقالہ راقم کا پمفلٹ کی شکل میں مطبوعہ۔ ایک مصری دانش ور کا نام میں یاد کر نہیں سکا۔ کچھ چیزیں ادارہ علم کی اور کچھ پالیسی سٹڈیز کی دیکھنی چاہئیں تھیں۔

منہج اور منہاج کے الفاظ بڑا اصطلاحی شکوہ رکھتے ہیں' مگر اردو زبان اس کے متبادل سادہ الفاظ دے سکتی ہے۔

(۵) پھر سیرت نگاری کا عنوان ہے جس میں "عربی مصادر سیرت" از سہیل حسن (مناسب فہرست ہے) اچھا مضمون ہے' مختصر بھی۔ دوسرا مقالہ "اردو زبان میں چند اہم کتبِ سیرت" کے مفید اور ضروری موضوع پر ڈاکٹر محمد میاں صدیقی نے لکھا ہے۔ خاصی کاوش کی ہے۔ ص ۲۶۳ پر نیچے سے سطر ۴ میں "امید نہیں" کا استعمال درست نہیں۔ امید اکثر اچھی چیز کی کی جاتی ہے۔ یہاں تو ہمارا مطلوب ہی یہی ہے کہ سلسلہ جاری رہے۔ مصنف نے جن کتابوں کو لیا ہے' ان میں شامل نہ ہونے والی بعض اہم کتابیں قاری کو احساس کی دلاتی ہیں۔ مثلاً جناب مناظر احسن کی کتاب

النبی الخاتم۔ یہ مختصر کتاب معلوماتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ "الرحیق المختوم" کا کوئی ذکر نہیں' سیرتِ سرور عالم از مولانا مودودیؒ سے اعتنا نہیں کیا گیا' تیسرا حصہ قریب بہ تکمیل۔ "سیرت احمد مجتبیٰ" بھی غائب اور اس کے ساتھ ہی سیرۃ البم۔ نقوش کا رسول نمبر نمایاں طور پر رسائل کے خاص نمبروں سے ممیّز ہے' اور اسے سیرت کا انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہیے۔ آج کا سیرت نگار اسے درکنار رکھ کر حق ادا نہیں کرسکتا۔ "عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ" ڈاکٹر حمیداللہ کی کتب۔ آنحضور کے سفر۔ حاضر ہونے والے وفود۔ مکاتیبِ نبویؐ۔ سیرتِ ابنِ اسحاق کا نایاب حصہ دریافت کرکے نقوش نے شائع کیا۔ عبدالرحمٰن عبد کی کتاب "آنحضور کے نقش قدم پر"۔ یہ کتاب سفرنامہ ہی نہیں' سیرت پر حاوی ہے۔ زبان' ادب اور عقیدت کے لحاظ سے انتہائی وجد آفریں۔ اس کی ضخامت کا بھی حق آتا ہے۔ غالباً صاحبِ مضمون نے پڑھی نہیں۔ رہی راقم الحروف کی سعیٔ ادنیٰ سو اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ۲۰ واں ایڈیشن زیرِ تیاری ہے' انڈیا میں الگ۔ ایک ضروری کتابی مقالہ (بہ سلسلہ پی ایچ ڈی) فیصل آباد کے ڈاکٹر خالد کا لکھا ہوا' سیرت کی کتابوں پر ہی بحث کرتا ہے۔ "غیر مسلم سیرت نگار" کے موضوع کے تحت ڈاکٹر محمد ریاض کا ایک مقالہ "مستشرقین کی کتبِ رسولؐ" سامنے آتا ہے۔ ۳۴ صفحے کا مضمون مطالعہ کا وسیع پس منظر سامنے لاتا ہے' اور ایک مقالے کی محدودیت کے لحاظ سے حق ادا کردیا گیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ایک مکمل ضخیم نمبر اس موضوع پر آنا چاہیے اور مستشرقین کی دانستہ دسیسہ کاریوں' حالات اور افراد کے متعلق مغالطوں پر' قرآن کے انسانی کلام ہونے کے دعوے کے ساتھ اس پر حملوں' حضورؐ کی احادیث پر نہ صرف بات بات پر نکتہ چینی اور معجزات اور پیش گوئی کی تضحیک یا تردید' نیز احادیث کے خلاف مسلمانوں میں اندھی عقل پرستی اور احکام کو بدلنے کی بد آموزی یہ وہ زیادتیاں ہیں جن کی وجہ سے ہمارے دور کا فتنۂ انکارِ حدیث ابھرا اور دوسرے علمی راستے سے مذہبی امور میں مستشرقین پرستی ذہنوں کے اندر اتر گئی۔ اس سے ہمارے علومِ افکار کو پھپھوندی لگ گئی۔ پھر ممتاز لیاقت صاحب کا مضمون ہے "مقامی زبانوں میں غیر مسلم مصنفین کی کتبِ سیرت"۔ ۲۵ صفحے کے مضمون میں اچھا مواد جمع ہوگیا ہے۔

تعارفِ کتب کے ذیل میں سیرۃ المصطفیٰ' سیرۃ احمد مجتبیٰ اور سیرۃ البم پر تبصرے درج ہیں اور مفید مطالعہ ہیں۔ (ن - ص)

سالانہ مجلہ تحقیق : مجلسِ مشاورت : غلام مصطفیٰ خان' مسز رابعہ اقبال' ڈاکٹر نجم الاسلام (مدیر)۔ ناشر : شعبہ اردو' سندھ یونیورسٹی' نیو کیمپس' جام شورو' سندھ یونیورسٹی۔ ضخامت ساڑھے چار سو صفحات۔ قیمت ۶۰ روپے۔

سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے دسمبر ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہونے والے اس ضخیم مجلہ میں کم سے کم درجن بھر ڈاکٹروں (علمی) نے حصہ لیا ہے۔ دوسرے تمام لکھنے والے بھی کوئی کسی شعبہ کے صدر ہیں' کوئی پروفیسر ہیں' اور اکا دکا بیرونی نامور لکھنے والے۔

میں نے جو مغز کے چند سو سیل "تحقیق" کے لیے خاص کرکے ورق گردانی کی تو بہت مرعوب ہوا۔ ایک تو میں نے مخزن الغرائب وانیس العاشقین کے ادبی معرکے کی داستان طویل (۲۳ صفحے) نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھنی شروع کی' پھر جب ۶' ۸ ورق پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ دلچسپی کی برف پگھل کر کم ہوئی ہے تو کسی اور آئس برگ کی تلاش ہوئی۔ مگر خاتمے تک پہنچتے پہنچتے ہماری دلچسپی کا پورا سیاچن تحلیل ہوگیا۔ آگے بڑھیں تو دشمن کا خطرہ۔ مجبوراً ڈاکٹر نجم الاسلام کے لحاظ ملاحظے کے لیے آخری لفظ تک پڑھ ڈالا۔ جیسے یہ خیال دل میں بیٹھ گیا ہو کہ نجم الاسلام دیکھ رہے ہیں۔ مزاح درکنار' یہ نتائج محنت بڑے قیمتی ہیں۔ ایک اہم مقالہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی عطا ہے۔ "سندھ مکران کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کے چند نئے ماخذ" (۴۴ صفحے) آنکھوں سے لگایا۔ اسی فرصت میں ص ۳۰ کے شجرے دیکھے مگر نگاہ دوسری طرف گھوم گئی۔ دوسری طرف اشعار سبحان اللہ ! پھر تو پورا مشاعرہ ہی شروع ہوگیا ہے۔ آپ کے مضمون کے خطِ تحقیق سے ذہول ہوا اور اشعار سے دل کھل کر پھول ہوا۔ زمانہ کتنا بوا لفضول ہوا۔ مگر آپ داد وستد سے بالاتر ہوکر وہ کام کر گئے کہ نسلوں کے کام آئے گا۔ بس خدا کرے کہ نئی نسل تعلیمی ماحول کو برادرانہ بنا دے اور من وتو کے تمام امتیاز مٹ جائیں۔ تب تخلیق بھی ہوگی اور تحقیق بھی !

سندھ کی پاکستان کے لیے اہمیت ہے' ابوالقاسم اور باب الاسلام والا سندھ' آج نواز شریف جیسے لیڈر اور فوج کے لیے ممنون احسان سندھ' اس کے لحاظ سے آپ نے اس کی تاریخ کے جو بھی دفتر کھنگالے ہیں' اور جو بھی نئے ماخذ نکالے ہیں پاکستان پر احسان کیا ہے۔ سندھ خوش تو پاکستان خوش۔ ہمیں تو اس سندھ کو تاریخی' جغرافیائی' ارضیاتی' صنمیاتی' ثقافتی اور لسانی ہر لحاظ سے اچھی طرح پہچاننا ہے۔ کتنے ہی بے جان پہچان کے روگ میں مارے گئے۔

تذکرۂ شعرائے کاشمیر بھی تاریخ' ادب اور موجودہ حالاتِ کشاکش کے لحاظ سے مفید ہے۔ مکتوبات بہڑائچ پھر ایک اہم مضمون ہے۔ بہڑائچ میں بزرگان سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ "مظہریہ"

کے مکاتیب کے پہلے بھی کچھ مجموعے چھپتے رہے ہیں۔ اب ایک تازہ مجموعہ مکتوب مولوی نعیم اللہ بہرائچی خلیفہ حضرت مظہر کی خانقاہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ خطوط غلام مصطفیٰ خان کو مولانا ابوالحسن زید فاروقی سے بصورت عکسی نقل حاصل ہوئے ہیں۔ یہاں انھی مکاتیب کی تفاصیل پر گفتگو ہے۔ قابلِ تعریف کام ہے۔

ایک ادبی بحث نشاط کی بکٹ کہانی اور طالب کا تیرہ ماسہ (یا تیرا ماسہ) مسز رابعہ اقبال نے چھیڑی ہے۔ بحث پرلطف ہے اور بکٹ ہجریا غم یا مشکلات کے معنوں میں ہے۔ بکٹ کہانی کا ہیولیٰ چونکہ بلندی میں بنا تھا۔ اس لیے عورت کی طرف سے اس میں ماہ بہ ماہ بدلتے موسموں کی ہجرزدہ طبیعت کی اثر پذیری اور اس کا اظہار ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ کہانی کی یہ عورت ایسے اپنا دکھ بیان کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کلیجے کے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ باقی رہیں تحقیق انیق کی باتیں' سو وہ خود پڑھیے گا۔

"خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ ہندوستان ۱۹۰۷ء" فہمیدہ شیخ نے اس تحریر کے ذریعے گویا ماضی اور حال کی ملاقات کرنے کی کوشش بذریعہ "تحقیق" کی ہے۔ واقعی حسن نظامی اور ان کے معاصرین اور ان کا دور اور اس وقت کی جریدہ نگاری اور اخبار نویسی' نیز وہ خاص نقشۂ احوال جو ہندوستان میں ہر آدمی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اور عالمِ اسلام کی مصیبتیں اور ساری دنیا میں امپریلزم کے بٹوارے۔ توبہ! توبہ ---- اور آج اس سے بھی زیادہ توبہ۔

"جام شورو کے مخطوطات --- قسط چہارم" یعنی سندھی ادبی بورڈ کے بقیہ ادبی مخطوطات کی فہرست جو ڈاکٹر نجم الاسلام کی محنت کا ماحصل ہے۔ ان میں ۲ اضافات کا بھی ذکر ہے۔ جن میں ایک پر ڈاکٹر الیاس عشقی نے اور دوسرے پر ڈاکٹر نجم الاسلام نے وضاحتیں لکھی ہیں۔

آخری حصہ تبصرے --- رفتار تحقیق اور مجالس تحقیق کے مذاکرہ پر مشتمل ہے۔ تبصرہ نگار ڈاکٹر نجم الاسلام' مرزا سلیم بیگ' عتیق احمد جیلانی ہیں۔

ہم نے تو رسالہ تحقیق ایڈٹ کرنے جتنی محنت کرڈالی۔ اب اپنا مسلک' نیکی کر دریا میں ڈال۔ (ن - ص)

قارئین ترجمان القرآن سے التماس ہے کہ ماہنامہ ترجمان القرآن کی توسیع اشاعت کے لیے چلائی جانے والی مہم میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون فرمائیں۔ اس سلسلہ میں اس پرچے کے ساتھ ایک خریدار کارڈ منسلک کیا گیا ہے' جس پر پاکستان میں ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ سالانہ خریداری پر آمادہ احباب سے یہ کارڈ پر کرواکر حوالہ ڈاک فرمائیں۔ مزید کارڈ بھی طلب کریں۔ (ادارہ)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۳۲۲ء میں جاری کردہ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر مسئول خرم مراد

اُمت و انسانیت کے مستقبل کا رہنما رسالہ

اب مستقبل اسلام کا ہے!

- اسلامی زندگی کی تشکیلِ نو • مغرب کا تہذیبی و سیاسی تسلط • عالمِ اسلام، احیائے اسلام اور اسلامی تحریکات
- تزکیۂ نفس و اجتماع • پاکستان کے قومی مسائل

آپ کے ذہنوں میں سلگتے سوال — ہمارے جواب

نیوز پرنٹ کی بجائے سفید کاغذ — صفحات ۵۶ سے بڑھ کر ۸۸	تزئین نو کے بعد پہلا شمارہ — ماہ ستمبر ۱۹۹۳	قیمت فی شمارہ ۱۰ روپے، سالانہ چندہ ۱۰۰ روپے — بذریعہ ہوائی ڈاک: یورپ امریکہ: ۲۵ ڈالر، دیگر ممالک: ۲۰ ڈالر	آج ہی اپنے ایجنٹ کو آرڈر دیں یا سالانہ خریدار بن جائیں

ایجنٹ ۱۵ اگست تک آرڈر بک کرا دیں

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار۔ لاہور فون نمبر 7234014 7236665